ابوالکلام نمبر

اگست ۱۹۵۸ء
شراون بھادوں شک سمت

ایک روپیہ

"ابوالکلام نمبر" کے لئے

وزیر اعظم کا پیغام

82465

اس سال کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کے دل و دماغ پر شدید اثر ہوا ہے اس کی تھوڑی سی جھلک اس دن دہلی میں نظر آئی جب کہ دہلی کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں مولانا کو اپنا آخری خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے

ہم جب بعض چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہمیشہ رہیں گی اسی طرح اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی ہمیں کچھ ایسا ہی گمان ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی ایسا شخص اچانک اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی زندگی اور اس کی ذات ہمارے لئے کیا معنی رکھتی ہے مولانا آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کی شخصیت کا ہندوستانی قومی تحریک کے ساتھ ساتھ نصف صدی سے زیادہ مدت میں ہوئی انھوں نے قومی تحریک کے مختلف دور دیکھے وران میں حصہ لیا وہ اس کی جد وجہد اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور اس کے مقاصد کی تکمیل میں شریک رہے وہ اس تحریک کا ایک اہم جزو تھے اور انھوں نے بڑی حد تک اس کی تشکیل کی۔ پھر بھی وہ ایک جید عالم اور منفرد ادیب بھی رہے ملکیوں جتنا چاہیئے کہ وہ ہندوستانی عوام کے انبوہ کثیر میں یکہ و تنہا حیثیت کے مالک رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی صرف اسی کی وجہ سے انھیں ہماری قومی تاریخ میں ایک بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔

اس کے علاوہ ان کی ذات غیر معمولی علمیت اور حیرت افزا ذہانت کی حامل تھی جس پر کبھی جذبات یا تعصب کا غلبہ نہیں ہونے پاتا تھا سب سے بڑی کرامات یہ ہے کہ ان کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں ہندوستان کی اس گوناگوں تہذیب کا عکس پایا جاتا تھا جسے بہت سے بیرونی دھاروں نے متاثر اور مالامال کیا ہے

بعض اعتبار سے اُن کی طرز فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا اور وہ اُس دور کے شعور کا ایک عکس تھے جسے روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنھوں نے اس مقصد کو جس کے لئے وہ عمر بھر کوشاں رہے ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا پُرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اُسے واپس نہیں لا سکتے لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اسی طرح ہم مولانا آزاد کی یادوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا سبق سیکھ سکتے ہیں

جواہر لال نہرو

نئی دہلی
۵ جولائی ۱۹۵۸ء

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل
دہلی

(سالنامہ)

ابوالکلام نمبر

مجلس ادارت

محمد مجیب — جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور — حیدرآباد
گوپی ناتھ امن — دہلی
خواجہ احمد فاروقی — دہلی
زمان راہی — سری نگر
یو۔ ایس۔ موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی۔ این۔ ایس۔ راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی سچدانند داستی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو و سکریٹری (مدیر مسئول)

اسسٹنٹ ایڈیٹر ۔ مظفر شاہ

سرورق :- مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رنگین تصویر (ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے ذخیرہ تصاویر سے ۔ بہ شکریہ بیگم زہرہ انصاری)

جلد ۱۷ — اگست ۱۹۵۸ء
نمبر ۱ — شراون بھادوں شک سمت ۱۸۸۰

سالانہ چندہ -	ہندوستان میں :-	چھ روپیے
	پاکستان میں :-	چھ روپیے (پاک)
غیر ممالک سے :-	دس شلنگ یا ایک ڈالر	
فی پرچہ :-	ہندوستان میں :-	چھ آنے
	پاکستان میں :-	آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سکریٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند
پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
تعارف	ادارہ	۲
ملاحظات	ادارہ	۳
اظہارِ عقیدت	ڈاکٹر سید محمود ۔ بخشی غلام محمد ۔ حافظ محمد ابراہیم ۔ مسز ارونا آصف علی	۴
تاریخ انتقال ابوالکلام آزاد	ماہر القادری	۷
فردوس گم شدہ	عباس فیضی	۸
قطعہ تاریخ وفات مولانا آزاد	ذوقی سنگھوری	۱۰
ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۱
عہد آفریں شخصیت	ہمایوں کبیر	۱۴
قطعہ تاریخ ماہ و سن وفات آزاد	منظور علی تمنا فاروقی سحوری	۱۶
مولانا آزاد کی صحافتی عظمت	نیاز فتحپوری	۱۷
ماتم آزاد	جمیل مظہری	۲۳
مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور ان کے جواب	محمد اجمل خاں	۲۷
مولانا ابوالکلام آزاد	خواجہ غلام السیدین	۳۷
قطعہ تاریخ وفات مولانا آزادؒ	سرفراز حسین رضوی صبر لکھنوی	۴
ابوالکلام بہ حیثیت انشا پرداز	ظفر حسین خاں	۴۱
مولانا ابوالکلام آزاد (نظم)	بسمل سعیدی	۴۶
تذکرہ	محمد مجیب ۔ مترجم ۔ محمد شفیع الرحمٰن	۴۸
مولانا آزاد غبارِ خاطر کے آئینے میں	گوپی ناتھ امن لکھنوی	۵۵
مولانا آزاد حضرتِ عاقل میں	عبدالرزاق ملیح آبادی	۶
مولانا آزاد کا ایک خط	———	۶۷
آہ ! مولانا ابوالکلام آزادؒ	یحییٰ اعظمی	۷۱
مولانا ابوالکلام آزادؒ ۔ ایک نادرِ روزگار شخصیت	غلام رسول مہر	۷۴
قطعہ تاریخ وفات امام الہندؒ	روحی الہ آبادی	۷۹
ترجمان القرآن	سعید احمد اکبر آبادی	۸۰
امام الہندؒ کی یاد میں	روش صدیقی	۸۴
مولانا آزادؒ کے فکر و نظر کی چند جھلکیاں	حافظ علی بہادر خاں	۸۵
خضریات	شمیم کرہانی	۹۱
امام الہند مولانا آزاد ۔ سفر اور مقصدِ سفر	محمد یونس خالدی	۹۴
مردِ آزاد	خواجہ احمد فاروقی	۱۰۵
تیرے بعد	اعجاز صدیقی	۱۰۹
مولانا آزاد کی شخصیت (آثارِ ابوالکلام آزاد کی روشنی میں)	ریاض الرحمٰن شروانی	۱۱۱
زلیخا	حمیدہ سلطان	۱۱۸
نگارشاتِ آزاد میں طنز و مزاح	غلام احمد فرقت کاکوروی	۱۲۲

تعارف
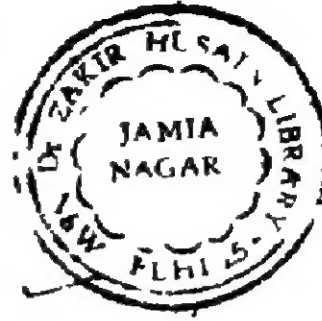
نام	تعارف
ڈاکٹر سید محمود	مولانا آزاد مرحوم کے پرانے رفیق کار، مشہور قومی رہنما، ممبر پارلیمنٹ
جناب بخشی غلام محمد	پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر۔
جناب حافظ محمد ابراہیم	وزیر آبپاشی و بجلی، حکومت ہند
مسز ارونا آصف علی	مشہور قومی لیڈر اور دلی کارپوریشن کی میئر
جناب ہادی قادری	اُستاد ادبیات عربی و اردو نظام کالج حیدرآباد
جناب فضا ابن فیضی	خوش گفتار مقبول شاعر۔ (مئوناتھ بھنجن۔ یوپی)
حضرت والی سکوری	جنوبی ہند کے کہنہ مشق شاعر
ڈاکٹر ذاکر حسین	صاحب فکر و نظر، مشہور ماہر تعلیم، بہار کے گورنر
پروفیسر ہمایوں کبیر	وزیر سائنسی تحقیقات و امور ثقافت حکومت ہند۔ مولانا آزاد سے آپ کا قریبی تعلق رہا
جناب منظور علی صبا فاروقی	بجنور (یوپی) کے ایک پرانے شاعر
مولانا نیاز فتحپوری	مشہور انشاپرداز، مدیر نگار، لکھنؤ۔
علامہ جمیل مظہری	کہنہ مشق اور مخلص شاعر۔ پٹنہ کالج (پٹنہ)
مولانا محمد اجمل خاں	مولانا آزاد مرحوم کے معتمد خصوصی، علم و ادب کے شیدائی۔ علم سیاسیات پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔
جناب خواجہ غلام السیدین	سیکریٹری وزارت تعلیم حکومت ہند۔ ممتاز ماہر تعلیم۔
جناب سید سرفراز حسین رضوی جوہر	محلہ کاسس لکھنؤ۔
جناب ظفر حسین خاں	صحافی اور مصنف، سنگم سری ۹۰۵-۹۰۴، جہانگیر لکھنؤ۔
جناب بسمل سعیدی ٹونکی	زبان داں اور پختہ کار شاعر۔ فکر و فن میں ممتاز
پروفیسر محمد مجیب	وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) ماہر تعلیم اور تاریخ داں، رکن ادارہ
جناب محمد شفیع الرحمٰن	شعبۂ امور عامہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)
جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی	کہنہ مشق ادیب و شاعر۔ دہلی پبلک لٹریچر کمیٹی کے چیئرمین۔ رکن ادارہ
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی	مشہور صحافی، عربی زبان و ادب کے عالم۔ مولانا آزاد کے دیرینہ رفیق
جناب یحییٰ اعظمی	دارالمصنفین، اعظم گڑھ، مشاق اور خوش گفتار شاعر
مولانا غلام رسول مہر	ممتاز صحافی اور مشہور ادیب، مولانا آزاد کے قدیم دوست، ماہر غالبیات
جناب روحی الہ آبادی	حلیم انٹر کالج چمن گنج، کانپور
مولانا سعید احمد اکبرآبادی	پرنسپل کلکتہ مدرسہ (کلکتہ) عربی اور فارسی کے فاضل، اسلامی علوم کے ماہر اور مصنف
جناب روشن صدیقی	صاحب فکر، پختہ کار شاعر۔ پروڈیوسر (اردو) آل انڈیا ریڈیو۔
جناب حافظ علی بہادر خاں	ایڈیٹر دور جدید (دہلی)، کہنہ مشق صحافی۔ جدوجہد آزادی کے مخلص کارکن۔
جناب شمیم کرہانی	کوچہ میر عاشق۔ دہلی۔ خوش مذاق اور نغز گفتار شاعر
جناب محمد یونس خالدی	ابوالکلام اکادمی، ہوپ ہاؤس، مولوی گنج لکھنؤ، مولانا آزاد کے شیدائے ادب [illegible] اور ادیب
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	ریڈر (اردو) دہلی یونیورسٹی۔ صاحب فکر ادیب اور نقاد۔ رکن ادارہ
جناب اعجاز صدیقی	خوش فکر شاعر۔ ایڈیٹر "شاعر" قصر الادب، بمبئی
جناب ریاض الرحمٰن شروانی	حبیب منزل علی گڑھ۔ مولانا آزاد کے حبیب لبیب حبیب الرحمٰن شروانی مرحوم کے پوتے۔ نوجوان ادیب
محترمہ حمیدہ سلطان	مشہور ادیبہ۔ انجمن ترقی اردو دہلی کی جنرل سیکریٹری
جناب غلام احمد فرقت	مشہور مزاح نگار۔ معلم اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول۔ دہلی

ملاحظات

بڑی بڑی طاقتوں کی باہمی کشمکش اور ایٹم و ہائیڈروجن بموں کی تیاری نے دنیا میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی ہے اور ہر لمحہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی معمولی سا حادثہ عالم گیر جنگ کا بہانہ نہ بن جائے۔ ایک طرف یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف ایٹمی تجربات نے نسل انسانی کو زبردست خطرے میں ڈال دیا ہے۔ آج بھی ان کے جو مضر اثرات فضائے بسیط پر پڑ رہے ہیں وہ کچھ کم نہیں۔ اور آئندہ کے خطرات کا اندازہ متحدہ اقوام کی بین الاقوامی سائنٹفک کمیٹی کی رپورٹ سے ہو سکتا ہے جس کے بعض اقتباسات غیر سرکاری طور پر شائع کر دیے گئے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر ایٹمی دھماکے ۱۹۵۸ء کے بعد جاری رہے تو ان کی وجہ سے ہر سال کوئی سوا تین لاکھ اشخاص مہلک امراض میں مبتلا ہوتے رہیں گے اور ان امراض کا اثر آئندہ نسلوں پر بھی پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ ان دھماکوں کے اثرات آئندہ نسلوں پر پڑتے رہیں گے۔ اس رپورٹ سے ایٹمی دھماکوں کو روکنے کی ضرورت بالکل واضح ہو گئی ہے اور عام انسانی آبادی کی بقا اور تحفظ کا تقاضا یہی ہے کہ ان تجربات کو فوراً بند کر دیا جائے۔ روس نے از خود ایٹمی دھماکے روک دیے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کا اصرار ہے کہ پہلے اس امتناع کی پابندی کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے جنیوا میں مغربی اور کمیونسٹ ملکوں کے سائنس دانوں کی گفتگو شروع ہو گئی ہے کہ ایٹمی دھماکوں پر پابندی کی نگرانی کے ذرائع تلاش کئے جائیں۔ اگر نیت صاف ہے تو ذرائع کی تلاش اور سمجھوتے کی صورت کچھ مشکل نہیں۔

لبنان کی خانہ جنگی اور عراق کے حالیہ انقلاب کی وجہ سے مغربی ایشیا میں صورت حال انتہائی نازک ہو گئی ہے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے لبنان کے بارے میں واضح طور پر مشورہ دیا تھا کہ لبنان کا معاملہ اس کا اندرونی معاملہ ہے اور اسے وہیں کے لوگوں کو سلجھانا ہے مگر صدر شمعون کی اطلاع کی درخواست کی اور امریکی فوجیں لبنان میں پہنچ گئیں۔ دوسری طرف شاہ حسین کی درخواست پر برطانوی فوجیں اردن میں اتار دی گئیں۔ روس نے اس طرح فوجیں بھیجنے کو جارحانہ کارروائی اور بیرونی مداخلت قرار دیا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اپنے سرحدی علاقوں میں فوجی مشقیں شروع کر دی ہیں۔ ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب قومیت کا سیلاب بڑھتا جا رہا ہے تو اس میں بیرونی مداخلت نہ صرف مغربی ایشیا کو میدانِ کارزار بنا دے گی بلکہ امنِ عالم بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

ہمارے ملک میں بڑے بڑے دریا ہیں اور قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہیں بشرطیکہ انہیں قابو میں کر کے ان کے پانی سے کام لیا جائے۔ چنانچہ ملک بھر میں جگہ جگہ ان دریاؤں پر بڑے بڑے بند باندھے جا رہے ہیں تاکہ ان کے پانی سے زمینوں کو گلزار بنایا جائے اور بجلی پیدا کر کے کارخانوں کا جال بچھا دیا جائے۔ ان میں سے ایک بہت بڑا بند بھاکڑا ننگل بند ہے جہاں دریائے ستلج کو روک کر ایک سرنگ بنایا گیا ہے۔ پانی کا ذخیرہ ۶۴ مربع میل جھیل کی شکل میں ہے جو دنیا کی سب سے بڑی مصنوعی جھیل ہے جس سے نہریں نکالی جائیں گی۔ یہ کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ یکم جولائی کو وزیر داخلہ پنڈت گووند بلبھ پنت کے ہاتھوں ستلج نہر کے سرہند فیڈر کا افتتاح ہوا۔ اس فیڈر کی مجموعی لمبائی ۹۲ میل ہوگی جس سے پنجاب میں دس لاکھ ایکڑ اراضی اور راجستھان میں سات لاکھ ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے میں مدد ملے گی۔

"ابوالکلام نمبر" ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس شمارے کی ترتیب و تدوین میں بڑی محنت کی گئی ہے۔ ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ یہ اس عظیم شخصیت کے شایانِ شان ہو۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ نامور انشاپردازوں اور مولانا آزاد کے رفیقوں نے ہماری بڑی ہمت افزائی کی اور مولانا کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں قابل قدر مضامین عنایت فرمائے۔ مولانا جیسی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اس کے تمام پہلوؤں کا ایک شمارے میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی زیر نظر مضامین مولانا کی زندگی، ان کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات اور افکار و خیالات کے بہت کچھ آئینہ دار ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس نمبر کے بارے میں اپنی رائے سے ادارے کو مطلع فرمائیں گے۔

اس سال ہم نے سالنامہ کے علاوہ تین خصوصی نمبر نکالے۔ جن میں موضوعاتی مضامین ہی شامل کئے گئے اور دیگر مضامین جمع ہوتے گئے۔ چنانچہ ہمارے پاس منظور شدہ مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جس میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے مضمون نگار حضرات ابھی کچھ دنوں مضامین بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں۔

اظہارِ عقیدت

ڈاکٹر سید محمود ایم پی

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ ماہنامہ "آج کل" کا آزاد نمبر نکال رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات بابرکات اور شخصیت بابرکت کا تذکرہ ہماری قومی اور ملی زندگی کا لازمی جزو تھا اور رہے گا۔ اس سے ہر ادیب اور مصنف ہم حوصلہ پائیں گے، روشنی حاصل کریں گے اور یقیناً آئندہ کی ہماری ہر نسل کو اس سے سبق ملے گا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مولانا مرحوم ہمارے احساس و تاثر میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور تا قیامت جب تک "آج" ہوتے رہیں گے اور "کل" آتے رہیں گے اُن میں اُن کی زندگی کے نقوش ہمیشہ اُبھرتے رہیں گے۔ مولانا ہم سے جدا ہو چکے ہیں اور ہم اس محرومیت کی تھوڑی سی تلافی بس اب اسی طرح کر سکتے ہیں کہ ان نقوش کو سنوارتے رہیں اور ہر پہلو و بہر حال اُبھارتے رہیں۔

مولانا کی موت سے پورے ملک و قوم نے جو کچھ کھویا اُس کے احساس کی شدت کے ساتھ ذاتی رنج و صدمہ کی شدت نے شعور کو نڈھال کر دیا ہے ورنہ اُن کی ذات سے جو مجھے شغف رہا اور باون سال تک جو اُن سے پیار خصوصی حاصل رہا اُس کی ایک الگ داستان مرتب کرنے کے لئے اگر فرصت لمحات مل بھی جائیں، کئی کتابوں کے تر پورے کرنے کی ہمت بھی ہو جائے تو بھی مستعدیٔ دل و دماغ کہاں سے لاؤں گا؟ اس تمام عرصہ میں اُن سے خلوت و جلوت میں جو ملاقاتیں رہیں اور اُن سے جو برکات و فوائد مجھے حاصل ہوئے اُن کو میرا ہی دل جانتا ہے۔ اپنی واقفیت اور اپنے تجربہ کی بنا پر بلا خوف تردید یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم جیسا فاضل، عالم، مذہبی، طبائع اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والا اس وقت اسلامی دنیا میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی نے اسلامی دنیا میں دو بڑے مجاہد اور فاضل پیدا کئے، یعنی جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ۔ مولانا مرحوم ان دونوں کے نچوڑ تھے۔ اس سے زیادہ ان کے متعلق میں کیا کہوں۔

اب اُن کے گزرنے کے بعد مجھے جدائی کے لمحات میں شدت سے احساس ہوتا ہے کہ احمد نگر جیل میں مولانا جو یہ شعر

کم لذتم و بیشم افزوں زشمار است
گوئی نفسی پیشتر از بانگ وجودم

گنگنایا کرتے تھے وہ حقیقتاً شعر نہیں بلکہ اپنی زندگی، اپنی ہستی اور اپنی ہی بات کو بزیرِ لب دہراتے تھے۔ آنے والی تاریخ کا ایک لمحہ بھی اس سے منکر نہ ہو سکے گا کہ مولانا ایک ایسے انسانی پیکر تھے جس میں ایک سمت علم و فکر کی ایک وسیع دنیا آباد تھی تو دوسری سمت اخلاق و انسانیت کی وہ بلندیاں موجود تھیں جہاں وہ تنہا تھے اور اُن کا کوئی حریف نہ تھا۔

مجھے مولانا سے پہلی بار سنہ ۱۹۰۶ء کے آخری مہینوں میں علامہ عبداللہ عمادی جو عربی ادب کے فاضل اجل تھے کے ساتھ لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔ میری عمر اُس وقت سولہ سترہ سال کی تھی اور مولانا غالباً اُس وقت ۱۸ سال کے تھے۔ قبول صورت نہیں بلکہ نہایت حسین شکل تھی اور پوشاک کی تراش خراش و سراپا نفاست سے وہ بالکل الف لیلیٰ کی کسی داستان کے جیتے جاگتے شہزادے معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے یاد ہے سب سے زیادہ اُن کے طرزِ گفتگو نے مجھے متاثر کیا تھا جو خطیبانہ مگر تیز رو تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ معلومات کا دریا بہہ رہا ہے۔ علامہ عمادی اور اُن کے درمیان حماسہ، متنبی وغیرہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ اُن کے حافظہ کا

کمال یہ تھا کہ چھتیس سال بعد جب ۱۹۴۲ء میں قید فرنگ میں احمد نگر میں ہماری فرصت کا آماجگاہ بنا تو انھوں نے اُس پہلی ملاقات کے درمیان کی ساری گفتگو کا موضوع اور تمام تر تفصیلات مجھ سے دہرائیں، کمال حیرت کہ صرف وہی ملاقات نہیں بلکہ بعد کے بھی دوسرے واقعات اور لمحات کی یادیں جو میرے ذہن سے یکسر محو ہو چکی تھیں اُن کو بعینہٖ اس طرح یاد رہیں کہ جیسے سب کچھ کل کی بات ہو۔ اب جیسے ۱۹۰۶ء کی بات کہ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں علی گڑھ آئے تو دیگر حضرات کے ہمراہ میرے گھر سے بھی تشریف لائے۔ اس صحبت کی باتیں میں بھول گیا تھا لیکن ان کے حافظے نے وہ سب محفوظ کر رکھا تھا۔

فن خطابت کے اس تاجدار کے بارے میں بہت کچھ دہرایا جا چکا ہے لیکن میرے ذہن میں ہنوز وہ بس موقعے ایسے اُبھرتے ہیں جہاں میں نے انھیں اپنے الفاظ سے مجمع کے ذہنی دھارے کو اتنی آسانی سے موڑتے دیکھا کہ شاید کسی جادوگر سے بھی ممکن نہ ہوتا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب کہ جنگ بلقان کی گرما گرمی تھی۔ لکھنؤ میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سوال پیش تھا کہ مسلم یونیورسٹی گورنمنٹ کی شرائط پر منظور کی جائے کہ نہیں۔ اُس وقت الہلال کی دھوم تھی اور جب مولانا آزاد قیصر باغ کی بارہ دری میں آئے تو جلسہ میں پرہ دوڑ گئی اور ہر طرف سے مولانا کی تقریر کے لئے تقاضا ہوا مگر جو لوگ حکومت کے اشارے سے یونیورسٹی منظور کر لینا چاہتے تھے اُن کی خواہش۔ تھی کہ مولانا آزاد تقریر کریں لیکن مولانا کو اسٹیج پر جگہ دینی ہی پڑی اور اُن کی تقریر نے آن کی آن میں ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اور یہی رائے پاس ہوئی کہ اُن شرائط پر یونیورسٹی منظور نہ کی جائے۔ مولانا حق بات کہنے میں اس قدر بے باک اور نڈر رہے کہ انھوں نے کبھی وقت و محل کی بندش تسلیم نہ کی۔ جنگ بلقان کے متعلق ایک پبلک جلسہ عام کی صدارت نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم والیٔ رام پور فرما رہے تھے۔ جلسہ کا مقصد ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ مولانا آزاد جیسے ہی جلسہ میں تشریف لائے مجمع "الہلال" "الہلال" کہہ کر چلا اٹھا۔ انھوں نے اس موقع پر انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی نتیجہ سے نواب صاحب دم بخود جلسہ کی صدارت کرتے رہے۔

میرے اور مولانا کے ذاتی تعلقات ۱۹۱۲ء ہی سے سادہ کچھ زیادہ ہونے ہو گئے اور میں جب کبھی کلکتہ جاتا تو انھیں کے یہاں قیام کرتا تھا۔ اُن کی غیور اور خوددار فطرت کو بار بار نزدیک سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملتا رہا۔ انھوں نے کبھی اپنی خودداری کو مجروح نہیں کیا۔ ایسے مواقع بھی اُن کی زندگی میں آئے کہ انھیں

سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن دستِ سوال کبھی کسی کے سامنے نہ پھیلایا اور اپنے عزیز ترین دوستوں کو بھی خبر ہونے دی۔ جب وہ رانچی میں تھے تو اُن کو گورنمنٹ سے نظر بندی الاؤنس بہت کم ملتا تھا اور وہ بھی سارے کا سارا کتابوں کی خریداری میں ختم ہو جاتا۔ تکلیف وہ سرت کی زندگی تھی پر کبھی زبان پر اُف نہ آنے دی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری نے بہت منت و سماجت اور اصرار کے ساتھ کچھ مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ انا، وضع داری کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ضبط کا یہ عالم تھا کہ تساہل و بادری کسی انھیں غصہ آتا ہو ہر مرحلہ بہت حد تک ٹھنڈے دل سے سوچنے کے عادی تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی اپنی برائی کرنے والوں کو بھی برا نہ کہتے تھے اگر ایسے شخص کی کوئی اُن کے سامنے برائی کرتا تو وہ اُس کی کوئی اچھائی بیان کر کے بات لطیف کر دیتے تھے۔ صابر اس درجہ تھے کہ کسی حال میں بھی اور کسی موقع پر بھی انھوں نے اپنے سخت سے سخت معترضین کا بھی کبھی جواب نہ دیا۔ تقسیم سے پہلے لیگی حضرات دلآزاران نے اُن کی کیا کچھ تضحیک نہ کی مگر اُس بیک دل نے نہ اُس وقت کبھی پبلک اسٹیج سے اور نہ تنہائی میں اُن کی شکایت کی اور نہ وہ اُن کے بارے میں کبھی کوئی عامیانہ لفظ زبان پر لائے اور نہ بعد میں جب وہ قومی نظریئے کی ہلاکت کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا انھوں نے کبھی طعنے یا شکوے کر کے بدلہ چکانے کی سوچی بلکہ ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ کے مسلم کانفرنس کے اسٹیج پر جب وہ تشریف لائے تو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ مولانا آزاد اب مسلم لیگ کو برا بھلا کہیں گے۔ اس کے لیڈروں کی پولیں کھولیں گے اور اُن کی پالیسی کی دھجیاں اڑائیں گے۔ مگر اُن کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ "میں یہاں کسی کو ملامت کرنے نہیں آیا ہوں جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہم کو آئندہ کی فکر کرنی ہے۔" کون تھا جو اس بلند اخلاق اور حسن کردار سے متاثر ہوئے بغیر رہ جاتا۔ مسلمانوں کی گذشتہ مصیبت زماں سیاست کا جب آپس میں کبھی ذکر آتا تو یا خاموش رہ گئے یا اگر کچھ کہا تو صرف یہ کہا کہ "اپنے سینے کا داغ کس کو دکھاؤں؟"

گر میں مولانا کی شخصیت اور تمام زندگی کو ایک جملے میں بیان کرنے پر مجبور ہوں تو یہی کہوں گا کہ وہ انسان کے روپ میں فرشتہ تھے اور اُن کی زندگی ایک فرشتہ کی زندگی تھی۔

اس عظیم شخصیت کے لئے اچھے الفاظ تو کیا کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی لیکن فی الوقت بس اتنا کافی ہے کہ اُن کی سیاسی، ادبی، مذہبی خدمات ہمیشہ معلوم رہیں گی

پر ثبت رہیں گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بخشی غلام محمد پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور ان کی تعلیمات ہماری عظیم قومی ثقافتی اور ادبی میراث ہے۔ اس لئے مولانا کی یاد تازہ کرنا ایک اہم قومی اور ادبی فریضہ ہے اس سلسلے میں آج کل کا ابوالکلام نمبر ایک مبارک قدم ہے امید ہے کہ رسالہ مولانا کی زندگی اور فکر و عمل کے مختلف پہلوؤں اور ان کے چھپے ہوئے گوشوں کو اُجاگر کر کے تشنہ کاموں کی تشنگی کو دور کر سکے گا۔

مولانا کو کشمیر سے خاص شغف اور لگاؤ تھا۔ یہ رشتۂ اخلاص و محبت صرف ان کے ذوقِ جمال کا ہی رہینِ منت نہ تھا۔ دوستی اور یگانگت کا یہ علاقہ سیاسی عقائد و اعمال سے زیادہ متعلق تھا۔ سیاسی میدان میں مولانا نے متحدہ قومیت، انسانی جادۂ تعمیر اور امن کی راہ اختیار کی تھی۔ کشمیری عوام کا بھی یہی محبوب نصب العین مقصود رہا ہے۔ ناسازگاریٔ ریاست، اس دشوار گزار، کٹھن مگر قومی فلاح کے راستے پر کڑی سے کڑی آزمائش اور امتحان میں اسی طرح ایک زبردست عزم غیر متزلزل یقین اور پورے اعتقاد کے ساتھ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ڈٹے رہے۔ جس طرح مولانا نے اپنی ساری زندگانی میں زمانے کی ہولناک چیرہ دستیوں اور ظلم کی کج روی اور ستم رانیوں کے درمیان انسانیت کی سربلندی اور سرخروئی کے لئے فرقہ پرستی، تعصب، جہالت، حرص و آز کی باطل قوتوں سے زبردست قوتِ ارادی، محکم ایمان اور بے پناہ جوشِ عمل کے ساتھ لڑتے رہے یہ اُن ہی اصولوں اور آدرشوں کی یکسانیت اور یگانگی کی کرشمہ سازی ہے کہ آج کشمیر ہند کے رشتۂ اشتراک میں ایسے بندھا ہے کہ توڑنے سے ٹوٹ نہ پائے گا اور کشمیری عوام ہند کے دوسرے حصوں میں رہنے والے اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ تعمیر، امن اور فلاحِ عامہ کے لئے سرزمینِ ہند پر ایک تاریخی اور یادگار جنگ لڑ رہے ہیں۔ آج اگرچہ مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی تعلیمات اور اصول ہمیں پنڈت نہرو کی قیادت میں ایک ایسا سوشلسٹ سماج تعمیر کرنے پر اُبھار رہے ہیں۔ جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت، رنگ و نسل ہند میں رہنے والے سبھی لوگوں کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع اور سہولیات کی ضمانت دی گئی ہے۔

الغرض مولانا میدانِ سیاست کے شہسوار اور ہماری جدید تاریخ کے ایک ہیرو ہی نہ تھے۔ آپ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں ایک دور اندیش قومی رہنما بھی تھے، زبردست فلسفی بھی تھے، جادو بیان خطیب بھی تھے۔ صاحبِ طرز ادیب بھی تھے، جید عالمِ دین بھی تھے، اور منجھے ہوئے مدبر اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ مختصر یہ کہ مولانا کی ایک ہی زندگی میں بیک وقت کئی زندگیاں جمع ہو گئی تھیں مختلف اور رنگا رنگ حیثیتوں کی۔ جامع زندگی ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کا ایک حسین اور دل نواز امتزاج تھی جو ہماری سماجی اور ثقافتی زندگی کا حاصل ہے۔ اس حیثیت سے مولانا کی زندگی ہمارا ایک قابلِ قدر ورثہ ہے۔ وہ ورثہ جسے ہم سینے سے لگا کر اپنی اور اپنی نئی پود کی زندگیوں کو خوشحال اور تابناک مستقبل کی لازوال خوشیوں اور مسرتوں سے مالا مال کر سکتے ہیں۔

بس اس پیام کی وساطت سے میں ملک کے قومی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور عوام کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم ہندوستان کی [illegible]۔ کشمیر میں مولانا کی زندگی اور تعلیمات کی نورانی مشعل کو اسی طرح فروزاں رکھیں گے جس طرح اب تک روشن رکھے ہوئے ہیں۔

کامیابی کے لئے دعائیں

حافظ محمد ابراہیم وزیر آبپاشی و بجلی

مولانا مرحوم کی نسبت میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مولانا کے پاس سب سے بڑی چیز علمیت تھی اس کی نسبت مجھ جیسا جاہل کہہ ہی کیا سکتا ہے پھر بھی اتنا ضرور عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اُن جیسا اس زمانے میں کوئی اور نہیں تھا اور زمانہ صدیوں تک ایسا کوئی اور پیدا نہیں کر سکے گا۔ نہ معلوم دنیا کو کب تک انتظار کرنا ہوگا۔

دنیا میں بے مثال عالم ہونے کے علاوہ مولانا محبِ وطن اور بہت بڑے درجہ کے محبِ وطن تھے۔ کانگریس اور ملک کی خدمات جو مولانا نے انجام دیں ہندوستان کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہوں گی جس کو پڑھ کر ہماری آئندہ نسلیں فخر و مباہات کے ساتھ مرحوم کو یاد کریں گی اور ان کی سیرتوں میں اس یاد سے ایک علو اور بلند حوصلگی پیدا ہوگی۔ باوجود وفات مولانا ہمارے درمیان زندہ ہیں

مولانا ابوالکلام زندہ باد

مسز ارونا آصف علی میئر دلی کارپوریشن

مولانا آزاد کی عظمت کو چند سطروں میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی گوناگوں اور درخشاں شخصیت علماء اور عوام دونوں ہی کے لئے سرچشمۂ فیض تھی۔ جن کسی کو انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اس کے لئے یہ ایک بیش بہا تجربہ ثابت ہوا۔

مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے شاید سب سے زیادہ فصیح بیان وکیل تھے لیکن جن لوگوں نے ہندوستانی قومیت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں، ان کے لئے بھی مولانا کے دل میں انتہائی صبر و تحمل کے سوا کچھ نہ تھا۔ مولانا آزاد ہماری تاریخ میں ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کے نقیبوں میں شمار کئے جائیں گے جو قومی حیات کے لئے گویا ایک موسم بہار تھا اور جس نے ملک والوں کو بیدار اور تر و تازہ کیا۔

ان کی تحریروں میں نہ صرف ہمہ گیریت ہے جس نے انہیں ادب عالیہ بنایا ہے بلکہ ان میں والہانہ ادبی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ تحریریں کئی نسلوں تک ہندوستان کی تاریخ کو متاثر کرتی رہیں گی۔ ہمارے زمانے کا مؤرخ اگر مولانا آزاد کی زندگی کا بغور مطالعہ کرے گا تو اس کا کام آسان ہو جائے گا۔

گاندھی، نہرو اور آزاد یہ تین شخصیتیں ہندوستانیوں کی دو نسلوں کے خیال و عمل پر پوری طرح چھائی رہی ہیں۔ ان تینوں شخصیتوں کی قوت تاثیر اس بات میں مضمر تھی کہ عقل و کردار کے تین عجیب و غریب رجحانات کا ہم آہنگ امتزاج تھا۔

مولانا آزاد کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم ان کی عظمت اور دانائی کے ورثے کو برقرار رکھ سکے تو وہ آیندہ نسلوں کو متاثر کرتے رہیں گے۔

ہادی القادری

تاریخ انتقال ابوالکلام آزاد از ہادی

۱۹ ۵۸

ہوئے جو حضرتِ آزاد زیست سے آزاد
بپا ہے قصرِ حکومت میں نالہ و فریاد

وہ جن کو فکر ہو تاریخ سالِ رحلت کی
انہیں یہ چاہیئے رکھیں یہ شعرِ ہادی یاد

وزیرِ دانش و دانش در و ادیبِ شہیر

۱۳۸۳

مجاہدِ وطن، آزاد، ابوالکلام آزاد

۷۷۵ + ۱۱۸۳ = ۱۹۵۸

دلِ جذبۂ دل اور شدتِ احساس
بیان کر نہیں سکتا ہے نطقِ انسانی

کوئی بتاؤ تو کیا بات ہے کہ کرنے لگی
زبانِ کلکِ گہر بار اشک افشانی

یہ کون اٹھ کے گیا ہے کہ بزمِ اردو میں
ہوئی ہے رنج و غم و درد کی فراوانی

ملی ہے خوب یہ تاریخ سال وصل بھی
ابوالکلام خطیب و ادیبِ لاثانی

۱۳ ۷۷

وہ جو سب ابوالکلام کہیں
ایسے اچھے خطیب سے رخصت

عقل کرتی تھی جس سے استہلال[1]
ہند کے اس لبیب سے رخصت

دوستوں کے طلب جانتے ہیں
ہے قیامت حبیب سے رخصت

کوئی پوچھے اگر سنہ ہجری
کہئے ہادی ادیب سے رخصت

۱۳۷۷

[1] اہلال سے عقل نے روشنی حاصل کی ہے

گرہ کشائے زمانہ تھا تیرا ناخنِ ہوش
جنوں ملا تھا بڑا عہد آفریں تجھ کو

تری نگاہ سے اسرارِ شوق کب چھپتے
عطا ہوئی تھی نگاہِ کرشمہ بیں تجھ کو

ہوائے منزلِ جاناں کب آتی راس تجھے
قرارِ دل نہ سکا ایک پل کہیں تجھ کو

بلند تر تھی ترے ذوق و کیف کی دنیا
کہ جامِ زہر بھی تھا جامِ انگبیں تجھ کو

نچوڑ تھا کئی صدیوں کا شخصیت تیری
بھلا سکے گی نہ یہ خاکِ عنبریں تجھ کو

نہ رہ سکا قفسِ رنگ و بو میں خوگر تو
ازل سے فطرتِ آزاد لے کے آیا تھا

نکھر گئی جو رگِ گل میں بن کے خون کی بوند
وہ موجِ نکہتِ برباد لے کے آیا تھا

کسے خبر تھی تو ہستی ہوئی نگاہوں میں
فسانۂ دلِ ناشاد لے کے آیا تھا

غزل سرا رہا ہر دور میں جنوں تیرا
غلط کہ تو لبِ فریاد لے کے آیا تھا

ترے لبوں پہ دمِ واپسیں تھا کس کا نام
تو دل میں کس کی حسیں یاد لے کے آیا تھا

ذائق بنگلوری

قطعۂ تاریخ بر وفات امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

عالمِ جید، فقید المثل، دانائے علوم
زیں سرائے ششدری نقلِ مکاں فرمودہ اے

سرفروشِ ملک و ملت شہسوارِ حریت
بست رختِ زیست را و آخرت پیمودہ اے

روزِ شنبہ بود و بست و دو دیں از فروری
طائرِ جانش پئے پرواز را بکشودہ اے

زاد بودش بود کہ شصت و نہ سالہ حیات
در کنارِ خاکِ دہلی آخرش آسودہ اے

سال ترحیلش، مکرر گفت ذائق عیسوی

منبرِ قرآں از امام الہند خالی بودہ اے

۱۹ ۵۵

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

[illegible]

ڈاکٹر ذاکر حسین

ابوالکلام آزاد - ایک ہمہ گیر شخصیت

یہ تقریر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دلی کے اس تعزیتی جلسے میں فرمائی تھی جو صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی زیر صدارت ۲۴-فروری ۱۹۵۸ء کو منعقد ہوا تھا۔

راشٹرپتی جی، بھائیو اور بہنو! آپ جانتے ہیں کہ ہم آج کیوں یہاں [جمع] ہیں۔ اب تک آپ کے سامنے جو کچھ کہا گیا وہ مولانا کے ساتھیوں کی عقیدت کا اظہار تھا۔ میں مولانا کے ساتھی ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں میں تو ایک حقیر چیلے ہونے کا فخر رکھتا ہوں۔ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا اپنی زندگی بنانے کے لئے کہیں نہ کہیں سے روشنی اور گرمی لیتا ہے۔ میں جب ایک لڑکا ہی تھا اپنی زندگی کے مٹی کے دیئے کو سلگانا چاہتا تھا اور لوگوں کی طرح میں نے بھی روئی کی بتیاں بنائی تھیں۔ اور اپنی زندگی کے تیل میں ان کو ڈالا تھا اور ڈھونڈتا پھرتا تھا کہ ان کو کہاں سے جلاؤں۔ اس زندگی کی پہلی بتی، اس دیئے کی پہلی بتی میں نے مولانا کے دیئے سے جلائی تھی۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں ان کا "الہلال" پڑھتا تھا اور جب میں اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر اس کو پڑھتا تھا اور انہیں سناتا تھا اس وقت اس بتی میں آگ لگی تھی۔ یوں اور جگہ سے بھی میں نے آگ لی لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں پہلی آگ انہیں سے لی تھی۔ میں ان سے دور دور رہتا تھا اس لئے کہ میں سیاست کا آدمی نہیں ہوں۔ ہر وقت ان کے ساتھ کا موقع مجھ کو نہیں تھا لیکن جب کبھی ان سے ملتا تھا اور جب ملتا تھا تو ان سے روشنی اور گرمی پاتا تھا۔ [پچھلے] سال گذر کچھ عرصہ ہوا کہ ایک بات میں مجھے ان سے کچھ رنج ہوا اور میں ان [سے] کچھ کھنچا۔ اس وقت آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کم ظرفی [کی] وجہ سے اس کھنچاوٹ کو ان پر ظاہر بھی کیا مگر اس کو وقار نے، بجائے اس کے کہ اسے میری گستاخی سمجھے مجھ پر محبت کی بوچھار کی اور جب میں ان کے بلانے پر ان سے ملنے گیا تو میں شرم سے گڑا جاتا تھا اور وہ محبت سے اٹھے جاتے تھے اور میرے اوپر شفقت کی ایسی بارش ہوئی کہ میں اس کو کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔ مولانا بہت سی حیثیتیں رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے مذہب کے، بہت بڑے عالم تھے ادب کے، ادب پر بڑا گہرا بڑی نظر رکھتے تھے۔ بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ کتابوں پر عاشق تھے اور کوئی سیاست داں یہ نہ سمجھے کہ انھوں نے سیاست کی خاطر اپنے علم کو کبھی بھی چھوڑا ہو وہ آخر لمحے تک اس کے ساتھ وفادار رہے۔ ہاں وہ یہ جانتے تھے کہ علم ایک بار بھی بن سکتا ہے، علم ایک ایسا بوجھ بن سکتا ہے جو آدمی کو دبا دے اور اس کو ناکارہ کر دے۔ وہ علم کے ساتھ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے تھے۔ وہ اپنے وطن کے فرائض کو بھی جانتے تھے۔ انھوں نے آخر وقت تک علم کو نہیں چھوڑا اور علم کی لگن ان کے دل میں لگی رہی۔ کتابوں کی تلاش، چیزوں پر غور کرنا، ان کو سوچنا، ان کو سمجھنا، ان کے جوڑ ملانا، چاہے وہ تاریخی مسائل ہوں، چاہے وہ ادبی مسائل ہوں، چاہے وہ علمی مسائل ہوں، ان کا یہ شغل آخر تک باقی رہا۔ ابھی آخری مرتبہ دسمبر میں جب میں ان سے ملا تو وہ دو کتابیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کتابوں کے دیکھنے کے لئے پٹنے آنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ گوہاٹی کے سفر میں پٹنے آؤں گا اور وہ دو کتابیں دیکھوں گا۔ افسوس کہ

اس کا موقع ان کو نہیں ملا۔ علالت کی وجہ سے نہ وہ کانگریس میں گئے اور نہ اس کے جلسوں میں گئے لیکن ان کی یہ لگن آخری وقت تک رہی۔ مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ ایسے عالم تھے کہ علم کے بہانے سے اپنے تمام سماجی فرائض سے الگ ہو جاتے اور سماجی فرائض کا خیال نہ کرتے۔ انھوں نے اپنی مثال سے یہ بتا دیا کہ وہ اپنی ساری زندگی ایک مجاہد کی طرح اپنی قوم کی آزادی کے لئے اس کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اور آزادی حاصل ہونے کے بعد آزادی کو اچھی نیو اور بنیاد پر قائم کرنے کے لئے صرف کر سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ علم ایک گورکھ دھندا نہیں ہے کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دئے جائیں بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عالم، اس مفکر، اس مرد مجاہد نے کلمۂ حق کہنے، سچی بات کہنے، ناگوار سچی بات کہنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ سچ بات کا کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ سچ بات کہنے میں بڑی ناگواریاں ہیں۔ لوگ ناخوش ہوتے ہیں اور مولانا سے لوگ کیا ناخوش نہیں ہوئے۔ یہاں مسلمان بھائی ہوں گے۔ ہم سوچیں کہ ہم نے مولانا کا کس کس طرح دل نہیں دکھایا۔ ہم نے مولانا کو کیا کچھ نہیں کہا۔ کون سا بُرا لفظ ہے جو ہم نے ان کے لئے استعمال نہیں کیا لیکن اس وقار کے پتلے نے کبھی ایک لفظ کہا کسی کے متعلق؟ کوئی ہے یہاں جو یہ شہادت دے سکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی کی بابت کوئی ایسا کلمہ سنا کہ انھوں نے شکایت کی ہو یا بُرا مانا ہو۔ سب کچھ گزر جاتا تھا اور اس کی وہ بالکل پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ کلمۂ حق ضرور کہتے تھے۔ مشورہ لیجئے صحیح مشورہ دیتے تھے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ وہ کم آمیز تھے۔ کچھ عرصے سے زیادہ کم آمیز ہو گئے تھے۔ لوگوں سے کم ملتے تھے لیکن وہ سب کے ساتھی تھے۔ وہ اس کمرے میں بیٹھ کر ہمارے سب کے ساتھی تھے۔ اور اس طرح ساتھی کہ ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ اس لئے کہ جب وہ بات کہنے کی ضرورت ہوتی تھی جو ہم چاہتے ہیں کہ کہی جائے اور جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں اور ہماری طرف سے نہیں کی جا رہی ہے وہ اس کو کہتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ اس کو کہہ سکتے ہیں اور ایک مرد مجاہد کے واسطے یہ بہت بڑا مرتبہ ہے۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑی عبرتیں ہیں۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑے سبق ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا چونکہ میں ایک طالب علم کی طرح سبق لینے کے لئے ہی ان کے پاس گیا تھا۔ آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ وہ سبق جاری ہے اگرچہ وہ ہم میں نہیں رہے۔ جیسا کہ راشٹرپتی جی نے کہا کہ وہ قلم جس سے موتی برستے تھے، وہ قلم جس سے بجلیاں بھی گرتی تھیں، وہ زبان جس سے پھول برستے تھے اور جس سے چنگاریاں بھی برستی تھیں، جو باطل کو جلاتی بھی تھی اور سچ کو روشن بھی کرتی تھی۔ وہ زبان بند ہے وہ قلم ٹوٹ گیا ہے لیکن وہ مثال باقی ہے اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اس مثال سے گرمی بھی لیں اور روشنی بھی لیں اور اپنی زندگی کو ایسا بنائیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم بنائیں اور جس کی مثال وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے۔ اس قوم کے بنانے کا کام کوئی کھیل نہیں ہے۔

بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہتھیلی کے اوپر سرسوں جم سکتی ہے۔ اس میں نہ معلوم کتنے ابوالکلام کھپ جائیں گے، کتنی نسلیں کھپ جائیں گی اور یہ کام کبھی ختم نہ ہونے والا کام ہے۔

اس لئے ہمیں اپنے سامنے اس راستے کو رکھنا چاہیئے۔ ان مثالوں کو زندہ رکھنا چاہیئے۔ وہ اس طرح زندہ رہ سکتی ہیں کہ ہم وہ کریں جو وہ کرتے رہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم وہ نہیں کر سکتے ہیں جو وہ کرتے تھے۔ کسی کی جگہ پُر نہیں کی جا سکتی۔ بہت بڑے بڑے لوگ گزر گئے۔ جیسا کہ کسی نے ابھی حال میں کہا تھا کہ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ آسمان پر بہت سے ستارے ایک ساتھ آ جاتے ہیں۔ ہمارے قومی آسمان پر بھی بہت سے ستارے ایک ساتھ آ گئے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے جاتے ہیں۔ لیکن اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ پروا کر کے کچھ ہو نہیں سکتا۔ ان کا جانا ضروری ہے اور حق ہے۔ کوئی ان کو واپس نہیں لا سکتا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں کسی ترکیب سے ان کاموں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ جو کام ایک آدمی کرتا تھا وہ ایک ہزار آدمی مل کر کریں۔ لیکن اپنی زندگی کا رُخ وہی رکھیں۔ سچائی کی طرف رکھیں، عمل کی طرف رکھیں، علم کی طرف رکھیں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ جانیں کہ ہمارے اوپر جو فرائض ہیں وہ پوری طرح ادا کئے جانے کے لئے روز مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ فرائض کبھی ختم نہیں ہوتے۔

میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو انھوں نے یہ جتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو تفریق پیدا کرتی ہے، ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ مذہب چھوٹا مذہب ہے۔ انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے، مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لئے اپنے کو مٹانے کی روح ہے، مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے، ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام اُن لوگوں کو سیکھنا چاہیئے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر یا صوبے کے اوپر یا کسی ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بنا کر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں، تنگ وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دی جائیں۔ کسی کو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے لیکن اس کو پہلے اپنے دیس کا پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہیئے۔ تب وہ سچا مسلمان ہے، تب وہ سچا ہندو ہے، تب وہ سچا عیسائی ہے، تب وہ سچا پارسی ہے تب وہ سچا سکھ ہے۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے جیسا روشن طور پر ہمیں ملتا ہے اور یہ سبق جس طرح ہمارے واسطے آج کی زندگی میں اور ہماری قومی زندگی میں ضروری ہے اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ آج کا دن ہمارے لئے اس عہد کرنے کا دن ہے کہ ہم اس روح کو، مذہب کی سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما کریں۔

بہار و خزاں

اور امید و بیم

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جس قدر کاوش سے غور کیجئے گا۔ جذبات انسانی کی تحلیل و تجزیہ کے آخری عناصر یہی دو چیزیں نظر آئیں گی: امید و حسرت۔ جو کچھ کرتا ہے یا آئندہ کی امید ہے یا ماضی پر حسرت۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ امید و یاس کی تقسیم کو صرف افراد و اشخاص میں محدود نہ سمجھئے بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ باغ و چمن میں بہار و خزاں دو موسم ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ اور اپنی اپنی آمد کے تعاقب و مخالفت کا تار چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح امید و حسرت کو دو مختلف موسم تصور کیجئے جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں اور وہ نامرادی و کامرانی کی تقسیم ہے جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہے۔ بعض قومیں ہیں جن کے حصے میں امید کی بہار آئی ہے اور بعض جن کے حصے میں یاس و حسرت کے خزاں ہی کے لئے رہ گئی ہیں۔ موسم بہار زندگی و شگفتگی کا موسم ہوتا ہے، اور انسان کی رگوں کے اندر دوڑنے والے خون سے لے کر درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں تک ہر چیز میں جوش حیات اور ولولۂ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے جو اپنے دور امید سے گزرتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لئے ایک مہبط امید و حیات ہے اور اس کی ہر آواز ان کے کانوں کے لئے ایک ترانۂ امید کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو دل کا ہر گوشہ امیدوں اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے اور باہر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصہ عروس امید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس طلسم مایۂ بہجت و مسرت میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے نہ وحشت کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کا موسم ہیں۔ جب تک آپ کے دل کے طاق صحن میں امید کا چراغ روشن ہے۔ اس وقت تک دنیا بھی عیش و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر ادھر نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا تو پھر آفتاب نصف النہار درخشاں کیوں نہ ہو مگر یقین کیجئے کہ دنیا کا یہ تمام نظام شمسی آپ کے لئے ظلمت سرائے تاریک ہے۔"

(الہلال ۹ - اپریل ۱۹۱۳ء)

ہمایوں کبیر

عہد آفریں شخصیت

کوئی چالیس سال ہوئے جب مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار ہندوستان میں علم و ادب اور سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تھے، لیکن آج تک ان کے ہم وطنوں میں جن میں ان کے مداح اور ناقد دونوں شامل ہیں، اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ مولانا آزاد ایک ادیب کی حیثیت سے زیادہ نمایاں تھے یا بہ حیثیت سیاست داں۔ مولانا آزاد ابھی عنفوانِ شباب کی منزل میں ہی تھے کہ انھوں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' میں آتش نوا مضامین لکھ کر شمالی ہند کی ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ محض ادبی کاوشوں کے اعتبار سے بھی اردو زبان و ادب کی تاریخ میں یہ مضامین اپنی مثال آپ ہیں۔ خطابت، فصاحت و بلاغت، ذہانت و فطانت، تیکھے طنز اور اعلیٰ وارفع حیثیت کا ایسا امتزاج مشکل سے ہی ملتا ہے۔ "الہلال" کے اداریوں میں مضمون نگاری کے جو نمونے پیش کئے گئے، انھوں نے اردو نثر میں ایک نئے اسلوب نگارش کی بنیاد ڈالی۔

مگر اس وقت کے نوجوانوں کے دماغ جس چیز سے متاثر ہوئے وہ مولانا آزاد کے مضامین کی صرف ادبی فوقیت یا شاعرانہ حسن نہیں تھا۔ برطانوی اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی جدوجہد کے ناکام ہو جانے کے بعد سے ہندوستانی مسلمان مایوسی اور عدم اعتماد کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ سرسید احمد نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت سدھارنے کے لئے اس طریقے پر کوشش کی کہ حاکموں کی حمایت حاصل کی جائے اور مسلمانوں کو عملی سیاست سے دور رکھا جائے۔ سیاست سے گریز بالآخر سیاست کی مخالفت بن کر رہ گیا۔ ایسی منفی پالیسی بذاتِ خود بڑی پالیسی تھی۔ پھر اس وقت کے حالات کی وجہ سے یہ پالیسی ملک اور قوم کے لئے زبردست خطرے کا باعث ہو گئی۔ مسلمانوں کی سیاست سے الگ ہونے کی کوشش ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قومی بیداری کے بالمقابل تھی۔ جو اب سیاست میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے لگے تھے۔ سرسید کی ہندوؤں سے دوستی اور تعدد مراسم کے باوجود ان کی سیاست نے بالآخر ایک پلٹا کھایا۔ ان کی پالیسی جو کہ سیاست کے خلاف تھی ان کے جانشینوں کے ہاتھ میں ہندوؤں کے خلاف آلۂ کار بن کر رہ گئی۔

جس وقت مولانا آزاد ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں کی منظور شدہ پالیسی یہی تھی۔ اس وقت نیم سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے سامنے سرسید کی پالیسی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا یعنی برطانیہ سے تعاون اور ہندوؤں سے علیحدگی۔ جب مولانا آزاد نے واضح طور پر اس بات کی دعوت دی کہ قومی تحریک سے پورا پورا اتحاد اور تعاون کیا جائے اور برطانوی شہنشاہیت کی طاقتوں کی پُرزور مخالفت کی جائے تو پہلے پہل لوگوں کو بڑا دھکا لگا اور بعض سرکردہ مسلم سیاستدانوں کے بعض حلقے ناراض بھی ہوئے۔ اس وقت اہل الرائے مسلمانوں کی اکثریت کو مولانا آزاد کا یہ موقف ایک سراسر سیاسی بدعت دکھائی پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "الہلال" ہندوستانی مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے جذبے کے اظہار کا ذریعہ ہو گیا۔

مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قومیت، ترقی، آزادی اور جمہوریت کے تقاضوں کے حامی رہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد مذہبی علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی پرورش اور تربیت ان کی خاندانی روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ چوں کہ

مولانا آزاد مذہبیات کے زبردست عالم اور اسلامی حدیث و فقہ کے ماہر تھے اس لئے بعض لوگ شیخ اور قوم پرست کی حیثیت سے ان کے رول کو کچھ غیر متوقع سمجھتے تھے۔ لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ یہ بات انھیں لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے جو اسلام کی روایات کو بھول گئے ہیں اور صرف انھیں عقائد پر نظر رکھتے ہیں جو انگریز دور سے ہندوستانی مسلمانوں سے وابستہ کر دئے گئے ہیں۔ اسلام نے جس میں جمہوریت، آزادی اور عقلیت پر زور دیا گیا ہے جواں سال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی، جاگیردارانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ چنانچہ وہ ملک و قوم کو سیاسی غلامی، جاگیرداری، عزلت پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ یہ ہمہ گیر آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزلت نشینی کی خانقاہ سے نکال کر سیاست کے میدان کارزار میں لے آیا۔

لیکن سیاسی سرگرمیاں مولانا آزاد کی علمی حیثیت پر کبھی حاوی نہیں ہوسکیں ایک عالم کو زندگی کی مستقل قدروں سے تعلق ہوتا ہے جبکہ سیاست داں عام طور سے وقتی باتوں پر توجہ کرتا ہے۔ مولانا آزاد ڈپلومیٹ یا سیاسی چال باز سے زیادہ ایک بڑے مدبر تھے۔ ان میں دو خصوصیات تھیں جو ان کے تمام سیاسی اعمال کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یعنی ان کی سنجیدگی اور مزاجی توازن اور ان کی سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ اگرچہ وہ ایک شاعر کی طرح بے حد حساس واقع ہوئے تھے لیکن انھوں نے کبھی سیاسی فیصلوں میں اپنے جذبات کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ کسی شخص کے بارے میں ان کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ان کے فیصلوں میں کبھی آڑے نہیں آئی۔ انھوں نے ہر معاملے کو واقعیت پسندی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی اور یہ بات ان کے دوست و دشمن دونوں کے لئے تعجب خیز رہی ہے۔ اس مزاجی توازن اور سنجیدگی کی وجہ سے ان کا مشاہدہ بہت صاف تھا جب تک کوئی شخص معقولیت پسند رہتا ہے اور ہر بات کو دلائل کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اس وقت تک اس سے غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ سیاست میں اور دوسری جگہ بھی غلطیاں اسی وقت ہوتی ہیں جبکہ انسان پر تعصب غالب آجاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہم دیرپا معاملے کے مختلف پہلوؤں کو پرکھ نہیں پاتے۔ مولانا آزاد کی سنجیدگی اور سلجھی ہوئی قوتِ فیصلہ کی وجہ سے ان کے سیاسی فیصلوں کو ایک طرح کی حیرت انگیز حیثیت حاصل ہوگئی تھی جس سے دوست مرعوب تھے اور مخالف بدحواس۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیوں کچھ تاریخی ماخذوں میں بھی ان کے منہ سے غصہ یا طیش میں کوئی لفظ نہیں نکلا اور نہ انھوں نے کبھی کسی پر الزام دھرا یہاں تک کہ انھوں نے ان لوگوں کے خلاف بھی کسی غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا جنھوں نے ان کی بے عزتی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولانا ہر قسم کے طوفانی حوادث اور اختلافات کے درمیان ذرا نہیں گھبراتے۔ اس ضبط و نظم کی وجہ سے وہ ایک بے پناہ شخصیت کے مالک ہوگئے تھے۔ مولانا کی ہمت اور ارادے کی مضبوطی نے ان کے بدترین دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

چونکہ مولانا آزاد کی شخصیت ایک داستانی و رومانی بھی تھی اور کم آمیز بھی، اس لئے ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہو جانا لازمی بات ہے مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم زیادہ تر گھر پر ہوئی۔ البتہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ مصر ایک سیاح کی حیثیت سے جامعہ ازہر گئے تھے۔ ایک دوسری کہانی یہ ہے کہ مولانا نے بچپن میں ہی ایک عالم کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کرلی تھی۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے ایک مشہور عالم سے کسی موضوع پر ان کی طویل خط و کتابت ہوئی۔ پھر اس عالم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ بالمشافہ گفتگو کرکے بعض مسائل طے کرلئے جائیں۔ چنانچہ جب نوجوان مولانا اس بزرگ عالم کے پاس پہنچے تو انھوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور تپاک سے پوچھا کہ آپ کے بابا کیوں تشریف نہیں لائے آپ کو کیوں بھیج دیا۔ ایک اور کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ کسی جگہ مولانا کو خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا مگر جب مولانا وہاں پہنچے تو انھیں اندر جانے نہیں دیا گیا کیونکہ کسی کو یہ اعتبار نہیں آسکتا تھا کہ یہ بے ریش لڑکا وہی مشہور عالم ہے جس کا سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔

قدرت اکثر مختلف لوگوں کو مختلف قسم کے انعامات سے نوازتی ہے کسی کو جسمانی طاقت عطا ہو جاتی ہے تو کسی کو ذہنی قوت۔ قدرت بعض لوگوں کو دھن دولت دیتی ہے تو بعض کو شہرت و عظمت عطا کرتی ہے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ سارے انعامات ایک ہی شخص کو ملیں۔ مولانا آزاد ان چند خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جنھیں قدرت نے پورے طور پر وہ تمام چیزیں عطا کی تھیں جن کی ہر انسان آرزو کرتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ایک تضاد بھی پایا جاتا تھا جسے انسانی دماغ سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ یہ کہ ان تمام انعامات کے ساتھ انھیں حساس طبیعت بھی عطا ہوئی تھی اور ان کے دل میں انسان کے دکھ درد کے لئے ہمدردی بھی تھی۔ چنانچہ اپنی ذاتی کامیابیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے چاروں طرف

اس قدر غلطیوں فضولیات اور لغزت کو دیکھ کر بے چین رہتے تھے۔

مولانا آزاد جیسے شخص کے لئے روحانی طور پر ایک طرح کی تنہائی محسوس کرنا لازمی امر تھا۔ جو کوئی ان کے قریب آیا اس نے محسوس کیا کہ مولانا روحانی طور پر تنہا ہیں۔ مولانا آزاد بڑے خلیق تھے اور ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش تھی۔ پھر بھی ان کی دنیا الگ تھلگ تھی جس میں بہت کم لوگوں کا گذر ہو سکتا تھا وہ اپنے خیالات کی دنیا میں رہتے تھے اور اپنی طبیعِ خداداد کے بل بوتے پر دنیا کے دکھ درد کو برداشت کرتے تھے۔ وہ انسانی دکھ درد کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان میں قوتِ برداشت بھی تھی اور انسان کی بنیادی اچھائی پر انھیں پورا اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کی تکالیف میں اپنے آپ کو سنبھالے رہے۔ بنیادی طور پر وہ عقلیت پسند تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہر معاملے میں بالآخر منشائے الٰہی پورا ہوتا ہے۔ یہی ان کا ایمان تھا اور یہی اس نسل کے لوگوں کے لئے ان کی وصیت۔

منظور علی تمنا فاروقی بجنوری

قطعہ تاریخ بابِ وفاتِ آزاد

۱۹۵۸ء

ہزار حیف یکایک ز گلشنِ ایجاد	رفت سوئے جناں قبل بوئے گل آزاد
نرفت پیکرِ آزاد، رفت روحِ کبیر	چو شد کہ حیف جدا شد زخانہ خانہ زاد
دریغ، رہبرِ مخلص بہ وقت نامسعود	برفت و کرد دلِ دوستاں زغم ناشاد
زعیم عالی ہمم، نیک رائے، خوش تدبیر	کشادہ قلب و نظر، دور بین و دور افتاد
ادیب، نکتہ رس و اہلِ علم و صاحبِ فن	کہ بود جنتش جنتش پیامِ علم و ارشاد
ہزار عقدۂ مشکل، ز ناخنِ تدبیر	بہ صد خلوص بہ فکرِ رسا گرفت و کشاد
ہمیں کہ قوم و وطن را رہیدہ از فرنگ	بہ لبیتے کہ او آزاد بود، کرد آزاد
بہ قولِ فیصلِ خود مطمئن بہ استقلال	بہ عزم کوہ گراں بار، ہر چہ باد اباد
کسے نہ بود بہ ایماں، مجالِ برگشتن	زباں بگفت و نگوش آمدہ "بجا ارشاد"
دراں زماں کہ بایں ظلمت احتیاجش بود	ضیائے شمعِ ہدایت، دریغ رفت بہ باد
تمنا، ما دل غمگیں، چشم اشک فشاں	سرِ تلاش چو بر آستانِ فکر نہاد

برائے سالِ وفاتش [illegible] آمد

... کہ حیف رفت بہ جنت ابوالکلام آزاد

۱۳۷۷ھ

نیاز فتحپوری

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت

مولانا آزاد کی تمام ذہنی خصوصیات اور جامعیت فضل و کمال سے ہٹ کر محض ان کی صحافتی عظمت و خصوصیت پر اظہارِ خیال بہت دشوار ہے۔ مولانا کے صحافتی مدارج کا ذکر کرنا اور اُن تمام عطایائے فطرت کو نظرانداز کر دینا جو قدرت نے ان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کئے تھے ممکن نہیں کیونکہ مولانا کی صحافت عہدِ حاضر کی اصطلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف بھی تھی مختلف کہ اگر ہم اسے ماورائے صحافت کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو غالباً یہ تعبیر غلط نہ ہوگی۔

مولانا اپنی فطری افتاد، اپنے فکر و شعور، اپنے رجحانات و میلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیرمعمولی انسان تھے کہ یک وقت نہ ہم ان کے جملہ فضائل و خصائص کا احصار کر سکتے ہیں نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ان کی ادبی، علمی، مذہبی و صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم کر سکتے ہیں۔

لارڈ جارج سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ صحافی بننے کے لئے ایک انسان کو کیا کیا جاننا چاہیئے۔ انھوں نے جواب دیا "سب کچھ اور کچھ نہیں" یعنی صحافی درصل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے، لیکن ماہر کسی کا نہ ہو۔ لیکن مولانا کی یہ عجیب و غریب خصوصیت کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے ایسی خصوصیت تھی جس کی نظیر دنیائے صحافت میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

مولانا کے فضل و کمال کا تنوع، ان کے مطالعہ کی وسعت ان کا پاکیزہ جمالیاتی ذوق اور ایک خاص قسم کا عالمانہ رکھ رکھاؤ۔ ان سب کا امتزاج ان کے اندر پایا جاتا تھا کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا کر ہی نہیں سکتے۔ گویا وہ ایک ایسا کل ہے جس کا کوئی جزو اس سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے سامنے اگر مختلف رنگ کے پھول علاحدہ علاحدہ رکھ دیئے جائیں تو ہم ان کے رنگ و نکہت پر علاحدہ علاحدہ اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سب کا گلدستہ بنا کر سامنے لایا جائے تو ہم اسے گلدستہ ہی کی حیثیت سے دیکھیں گے اور امتیازِ رنگ و نکہت کا کوئی سوال ہمارے سامنے نہ ہوگا۔ بالکل یہی حال مولانا کے ذہنی اکتسابات کے تعدد و تنوع کا تھا کہ ہم ان کو ایک دوسرے سے علاحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ خواہ وہ شعر و ادب سے متعلق ہوں۔ خواہ مذہب و حکمت سے وابستہ ہوں۔ خواہ صحافت و سیاست سے!

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ اُن سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حالانکہ وہ سب زیادہ قیمتی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔

وہ امکانات کیا تھے ان کی تعیین و صراحت آسان نہیں، تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط و مطالعہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچہ میں ڈھل کر نہ رہ جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جانے کیا کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی و بدیع الزماں ہوتے اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے۔ اگر محض علومِ حکمیہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر

دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے مفکر و فلسفی نہ ہوتے۔ اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انہیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے اور اگر وہ مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔ واصل بن عطا کا ذکر آتا ہے تو اس کے تبحر علمی کا بھی ایک لطیفہ سن لیجئے۔ یہ پیدائشی توتلا تھا جسے عربی میں الثغ کہتے ہیں رے کا تلفظ وہ صحیح نہ کرسکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہانت اور لسانی مہارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہوجاتا تو وہ کوئی لفظ ایسا استعمال ہی نہ کرتا جس میں رے پائی جاتی ہے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ اگر تم کو یہ کہنا ہو کہ "وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور نیزہ اٹھایا" تو کیا کہو گے۔ عربی میں اسی مفہوم کو یوں ادا کریں گے 'رکب علی فرسہٖ و جرّد رمحہٗ' اس میں چار جگہ رے آتی ہے۔ واصل نے کہا کہ میں اسے یوں کہوں گا۔ "استویٰ علی جوادہٖ و سلّ صمصامہٗ" خیر یہ تو ایک دلچسپ بات تھی جس کا ذکر ضمناً آگیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد کو زبان پر اتنا ہی عبور حاصل تھا۔

مولانا عجیب و غریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جن کو زمانہ نے یا خود آپ کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم انہیں صرف الہلال و البلاغ کے رئیس التحریر، تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبار خاطر کے مصنف ہونے ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کے حالات زندگی اور ان کے ایمان و عقائد سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ورنہ یہ حکایت لذیذ دراز تر ہو جاتی۔ لیکن اگر ہم محض ان کی صحافتی زندگی سامنے رکھیں تو بھی اس کی بوقلمونی اور بوالعجبی ایسی نہیں کہ اس سے سرسری گزر جایا جائے۔ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم نے ابوالکلام کو پہچانا اور اگر زمانہ مساعدت کرتا اور ان کے صحافتی مشاغل جاری رہتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اور کون کون سے نوادر کارنامے بروئے کار آتے اور آج کتنا بڑا ذخیرہ علم و ادب کا ہمارے سامنے موجود ہوتا۔

مولانا کی فطری اہلیت و صلاحیت، قدرت کا ایک سربند راز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آگئے اور اکثر بے نقاب نہ ہو سکے۔ ان کا ایک سبب تو زمانہ کے حالات تھے جنہوں نے ان کو اپنے ذوق کی پوری وسعت سے کام لینے کا موقع نہ دیا اور دوسرا سبب ان کی فطری خلوت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام و نمود اور شہرت سے گریز کرتے تھے اور بربنائے متانت و خودداری وہ بے تکلفی میں بھی اپنی شان گرانمایگی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

مولانا کے دور صحافت کی تاریخی تعیین دشوار ہے۔ کیونکہ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ اس کا آغاز کب سے سمجھا جائے۔ مولانا کی علمی و صحافتی زندگی کے سلسلہ میں رسالہ مخزن، اخبار وکیل اور الندوہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا لسان الصدق کے اجراء سے ہوتی ہے۔ جسے انہوں نے خود جاری کیا، خود مرتب کیا اور خود ہی بند کردیا۔ جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ جس فضا و ماحول میں رہ کر اسے جاری کیا گیا تھا وہ مولانا کے لئے بہت تنگ تھی اور بہت سی ایسی باتیں جنہیں وہ زیادہ کھل کر کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی بہت کم سنی کا تھا اسی کم سنی کا کہ اس عمر میں لوگ اپنی تعلیم بھی ختم نہیں کر چکتے کسی عالمانہ قدم اٹھانے کا کیا ذکر ہے لیکن مولانا کی غیر معمولی ذہانت اور قبل از وقت پختگی ذہن و دماغ نے ان کے مستقبل کو بھی حال میں تبدیل کر دیا تھا اور لوگ اس مستقبل کی درخشانی کو دیکھ کر حیران تھے۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی کے اصرار پر الندوہ کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی تو فضا دوسری تھی، ماحول کچھ اور تھا۔ معاملہ عوام کا نہیں خواص کا تھا اور خواص بھی جماعت علماء کا لیکن مولانا نے اپنی انفرادیت کا اعتراف کرائے بغیر ان کو بھی نہ چھوڑا

علامہ رشید رضا ندوۃ العلماء کے عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا تقریر کرنے جارہے ہیں اور ضرورت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی و اردو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر برمحل ترجمہ کرتا جائے مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود اس خدمت کو انجام دیں اس لئے وہ اس بات میں بہت متفکر تھے۔ "آخر بجز نفس کوئی اور نہ آیا بروئے کار"۔ مولانا ابوالکلام بے تکلف سامنے آجاتے ہیں اور اس خدمت کو ایسی خوبی و دلکشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں۔

یہ تھا مولانا کی ذہانت و قابلیت کا پہلا عملی مظاہرہ جسے [illegible] مدعیان فضل و کمال نے دیکھا اور اسی وقت سے وہ حاسدانہ ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں جنہوں نے مولانا کو ندوہ و اہل ندوہ سے بیزار کر دیا۔ علاوہ اس کے وہ یوں بھی اپنی موجودہ خدمت سے کبیدہ خاطر تھے۔ کیونکہ الندوہ ایک خالص تعلیمی ادارہ کا آرگن تھا۔ مولویوں کا پرچہ تھا۔ جن کی باہمی رقابتوں سے وہ تنگ آ چکے تھے اس لئے انہوں نے اس خدمت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ تاہم اس دور ناخوشگوار میں بھی انہوں نے الندوہ کو جس بلندی تک پہنچا دیا وہ الندوہ کا دور زریں کہا جاتا ہے۔

یہی زمانہ تھا جب مولانا کی خطیبانہ شہرت بھی ملک میں عام ہوتی جا رہی تھی اور ان کے اندر زیادہ آزادی، زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کام کرنے کا ولولہ تیزی سے ابھر رہا تھا۔ چنانچہ آپ کلکتہ واپس گئے اور وہاں سے الہلال جاری کیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔

الہلال کے اجراء سے قبل مولانا کی صحافت زیادہ تر علم و ادب تک محدود تھی اور بہت گھٹی گھٹی سی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب وہ صحیح طور پر میدان صحافت میں آئے تو اس سال سے کہ افق صحافت پر ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور ایک نئی گرمی ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیونکر ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی جب مصر نے جامعۂ ازہر میں انہیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہ چنگاری اپنے سینہ میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حدت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلۂ جوالہ بن کر الہلال کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

جس وقت الہلال جاری ہوا ہے اس وقت ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے تاریک دور سے گزر رہا تھا اور روئے زمین کی دوسری قوموں میں بھی سخت انتشار پیدا تھا۔ ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں سنبھالا لے رہی تھی۔ استعماریت و سامراجیت اپنے بقا و تحفظ کے لئے اس جنگ کی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ ڈیماکریسی کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہونے جا رہے تھے اور قومی آزادی و خودداری کا احساس بڑے آزمائشی دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی مستعمرات کا طلسم ختم تو نہ ہوا تھا۔ لیکن اس سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنے بقا و تحفظ کے لئے آستینیں چڑھائے ہوئے ہر انسانیت کش اقدام پر آمادہ تھا۔ ہندوستان میں کانگریس آزادی کا بیج بو چکی تھی۔ اس کے کلے پھوٹ چکے تھے لیکن انگریز یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس پودے کو کبھی بارآور نہ ہونے دے گا اور جماعتی تفریق پیدا کر کے ملک کی ذہنیت کو دو متضاد حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ مسلم لیگ وجود میں آ چکی تھی لیکن مسلمانوں کی ذہنی رفتار ہندوؤں سے مختلف تھی ان کے سامنے ملکی مسائل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں ترکی، بلقان اور طرابلس پر لگی ہوئی تھیں اور سرسید کی تعلیمات نے جو وقار انگریزوں کا مسلمانوں کے دل میں پیدا کر دیا تھا وہ بڑی حد تک اپنی جگہ قائم تھا۔ ہر چند مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو انگریزوں سے منحرف ہو چلی تھی لیکن یہ انحراف و اختلاف داخلی نہ تھا، خارجی تھا، فاعلی نہ تھا، انفعالی تھا۔ وطن سے اس کا تعلق نہ تھا بلکہ مذہب و مذہبیت سے تھا۔ ملکی سیاست سے نہیں بلکہ ترکی کے انقلاب، بلقان و طرابلس کی تباہیوں اور مذہبی لامرکزیت کے احساس سے تھا۔ اس لئے ٹھیک اسی وقت جب کہ کانگریس اجتماعی تحریک آزادی کی بنیادیں استوار کر رہی تھی۔ مسلمان [illegible] کو چھوڑ کر سب سے بیرون ہند کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ جن کا تعلق زیادہ تر پان اسلامزم کی تحریک سے تھا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے دو قابل ذکر اخبار جاری تھے۔ ایک زمیندار، دوسرا مسلم گزٹ۔ زمیندار کی توجہ تمام تر ترکی پر مرکوز تھی اور اس کا عظیم ترین مقصد شہدائے بلقان کے پسماندگان کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ اندرون ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے اسے بہت کم دلچسپی تھی۔

مسلم گزٹ کے ایڈیٹر مولانا وحید الدین سلیم، مولانا حالی کے عزیزوں میں تھے اور قدرتاً انہیں سرسید تحریک سے دلچسپی ہونا چاہئے تھی لیکن یہ کہنا غلط ہو گا کہ وہ علی گڑھ یا مسلم لیگ کا آرگن تھا تاہم اس میں کلام نہیں کہ وہ مسلمانوں کا جماعتی اخبار تھا اور سیاست میں اس کا نقطۂ نظر ملت پرستی ہو تو ہو لیکن خالص وطن پرستی ہرگز نہ تھا۔ وہ آزادی کا محرک و معاون ضرور تھا

لیکن ہمیں جو لوگ طاہر ہو مسلم لیگ کے پیش نظر تھے وہ انگریزوں سے خوش نہیں تھا۔ لیکن اس کی ہر بھی جارحانہ تھی نہ حریفانہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا سا تھا جو روٹھتا ہے صرف منانے جانے کی توقع پر۔

یہ تھا وہ ماحول، یہ تھے وہ حالات، یہ تھی مسلمانوں کی عام ذہنیت جب مولانا آزاد نے الہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ کہ صحافت کا تمام اگلا پچھلا تصور ہمارے ذہن سے محو ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کیا یہ آواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی اپنے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" میں صدر اسلام کی حکومت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ ملوکیت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ شخصی استبداد کا اس میں مطلقاً گزر نہ تھا۔ ہم اسے ارستقراطیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ارستقراطیت یا جماعت اشراف کی کوئی حکومت دنیا میں ایسی نظر نہیں آتی جس نے سماجی مساوات اور عدل و انصاف کی اسی سخت پابندی کی ہو جتنی اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں کی گئی۔ ہم اسے ڈیماکریسی یا جمہوریت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ خلفاء اسلام کا انتخاب جمہور کی رائے سے نہ ہوتا تھا۔ ہم اسے اشتراکیت یا اشتمالیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس نے شخصی و انفرادی رائے کی آزادی کو نہیں چھینا۔ اس لئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ابتداء عہد اسلام کی حکومت خالص عربی اسلامی حکومت تھی جو خود مسلمانوں ہی نے وضع کی اور جس کی نوعیت حکومت کی تمام دوسری حکومتوں سے بالکل علٰحدہ تھی۔

میں جس وقت مولانا ابوالکلام کی صحافت پر غور کرتا ہوں تو میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی اخبار کی صحافت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ اس میں شانِ خطابت قطعاً نہیں ہوتی۔ مشرق میں البتہ بعض عربی رسائل و اخبارات کا لب و لہجہ خطیبانہ ہوتا ہے۔ لیکن ان میں وہ سوز نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں البتہ زمیندار ایک ملتہب رنگ اخبار تھا۔ لیکن اس میں الہلال کی سی گہرائی، سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم گزٹ کے لب و لہجہ میں بے شک ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا۔ عوام ہی کی زبان میں، اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لئے مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق بھی ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحافت خود ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا اور جو انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

مولانا نے الہلال بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا اور ملک کے حالات کے نہایت غائر مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ تو الہلال کے اجراء سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیئے۔ اور فرنگی تسلط کو ختم، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راہ ہے جس میں قدم اوّل قدم آسانی سے محسوس نہیں کر سکتی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام و مشترک جذبہ و ذہنیت پیدا کر کے مذہب و ملّت کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے حصولِ مقصود ممکن نہیں۔ ملک کی آئندہ سیاست کا جو نقشہ ان کے سامنے تھا اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تعمیر سے پہلے عمل تخریب سے کام لیا جائے۔ کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی ڈھانچہ اتنا بگڑ جائے کہ اس کی اصلاح و درستی ممکن نہ ہو تو ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے اس ڈھانچے کو توڑا جائے اور پھر از سرِ نو تعمیر کی جائے۔ وہ پرانے مٹے ہوئے نقوش اور کچے خطوط پر تعمیر کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ان کو مٹا کر نئی داغ بیل پر عمارت قائم کرنے کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہن انسانی رسوم و روایات سے اس حد تک داغدار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن و دماغ کو صفحۂ سادہ بنا کر اس پر دوسرے نقوش قائم کئے جائیں۔

یہی وہ اصول کار تھا جس کے پیش نظر انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہن سے سید احمد خانی نقوش مٹانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کی تمام آبادی بلا امتیازِ ملّت و مذہب، بلا امتیازِ نسل و رنگ کسی ایک غرضِ مشترک پر متحد و متفق نہ ہو جائے اور یہ اشتراکِ ذہن و عمل ممکن نہ تھا جب تک مسلمان ہندوؤں سے کٹ کر اپنے جداگانہ مستقبل کی تعمیر کا خیال ترک نہ کریں اور اس راہ میں سب سے زیادہ پتھر وہی ذہنیت تھی جس نے مسلمانوں کو انگریز کے رحم و کرم پر جینا سکھایا اور جو باوجود تلخ تجربات کے اب تک اپنے جذباتِ نیایش ہی کو حصولِ مقصود کا صحیح ذریعہ سمجھتے تھے۔

پھر آپ الہلال کے دورِ اوّل کے پرچے اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم

ہوگا کہ مولانا نے کس کس پہلو اور کن کن زاویوں سے اس ذہنیت کو توڑنا چاہا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں زمانہ بڑی آپا دھاپی کا زمانہ تھا۔ سخت ذہنی خلفشار کا دور تھا اور مولانا کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ان غیر ملکی مسائل کو نظر انداز کر دیتے جن سے براہ راست یا بالواسطہ مسلمانوں کے ادہان متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اصل مقصد کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انھوں نے طرابلس و بلقان کے مسائل پر بھی کا بہار گفتگو کی، ترکی کی امداد کی کوشش کی، اور اس کے ہونے والے انقلابات پر بھی واضح روشنی ڈالی اور جب مسجد کانپور کا حادثہ پیش آیا تو اس پر بھی اپنے قلم کی پوری قوت صرف کر دی۔ مگر یہ سب کچھ اس لئے نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے اور ان مسائل کا تعلق اسلام و اسلامیات سے تھا بلکہ اس سے مقصود صرف ظاہر کرنا تھا کہ جب کسی قوم پر بیرونی قوتیں مسلط ہو جاتی ہیں تو اس قوم کا کیا حشر ہوتا ہے اور اسے کتنے ذہنی و جسمانی دکھ جھیلنا پڑتے ہیں۔

مولانا کے سامنے ہی کانگریس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہ اس کے عزائم و اقدامات سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح وہ مسلم لیگ اور اس کے مقاصد سے بھی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دونوں ادارے کسی طرح ایک ادارہ میں تبدیل ہو جائیں اور مسلم لیگ بھی کانگریس کے اصول پر اپنا لائحہ عمل مرتب کرے۔ چنانچہ الہلال کا اولین دور اسی سعی و کوشش کا دور تھا کیونکہ ان کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ وہ کانگریس میں تنہا شریک نہ ہوں۔ بلکہ اپنی ساری قوم کو ساتھ لے کر شریک ہوں۔ لیکن وہ اس میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً انھیں تنہا کانگریس میں شامل ہونا پڑا۔

مولانا اہل ملک اور بالخصوص مسلمانوں کے ذہن تک جن جن راہوں سے پہنچنا چاہتے تھے ان میں سب سے زیادہ واضح اور روشن راہ مذہب کی تھی۔ چنانچہ آپ الہلال کا فائل اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دنیاوی سیاست و تعلیم کے سلسلہ میں ذہنی و اخلاقی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی تائید میں انھوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کئے ہوں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لئے احکام الٰہی کی حجت سے کام نہ لیا ہو۔

دوسری راہ جو مسلمانوں کے کلچر اور فطری ذوق کے لحاظ سے ان کے لئے زیادہ قابل قبول ہو سکتی تھی ادب و انشا کی راہ تھی۔ سو اس باب میں بھی الہلال کی یہ خصوصیت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ اس نے اشاریہ وغیرہ

شعر و ادب کا فراہم کر دیا کہ اگر آج تمام مشہور شعراء فارسی کا کلام دنیا سے محو ہو جائے تو بھی اس کا ایک بڑا مستقل انتخاب آپ الہلال کی مدد سے پیش کر سکتے ہیں۔

مولانا کی صحافتی عظمت کا تعلق کسی ایک چیز سے نہ تھا بلکہ اس کی تشکیل متعدد عناصر سے ہوئی تھی جن میں ایک بڑا زبردست عنصر ان کی غیر معمولی قوت حافظہ بھی تھا۔ ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے تار دیا کہ میں ان سے دہلی میں ملوں۔ وہ حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے صاحبزادہ جمیل خاں کی تقریب شادی میں شرکت کی غرض سے دہلی آ رہے تھے۔ یوں تو باہمی مراسلت اور میری نظموں کے ذریعہ سے جو الہلال میں شائع ہوتی رہتی تھیں میں مولانا سے غیر متعارف نہ تھا لیکن ذاتی ملاقات کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ میں اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر فتح پور سے دہلی پہنچا اور کامل ایک ہفتہ تک ان کی صحبت کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ اس دوران میں ادب مذہب و سیاست سے متعلق کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر مولانا سے تبادلۂ خیال کا موقع مجھے نہ ملا ہو اور میں ان کی قوت حافظہ و استدلال کو دیکھ کر دنگ نہ رہ گیا ہوں۔

ایک بار حکما و اسلام کے سلسلہ میں ابن طفیل کا ذکر آ گیا تو مولانا نے اس کی مشہور کتاب "حی بن یقظان" کی پوری داستان ایک نشست میں اس طرح سنا دی گویا وہ اس کے حافظ تھے۔ ایک دوسری صحبت میں جو سیاست سے شروع ہوئی اور ادب پر ختم ہوئی اس سے زیادہ دلچسپ تھی۔ انسان کے فطری احساس آزادی اور ضمیر انسانی کی بے اختیار پکار کے سلسلے میں، میں نے کہا کہ اس کے مظاہر انتہائی متضاد ماحول میں کبھی کبھی سامنے آ جاتے ہیں۔ عرفی مدحیہ قصیدہ لکھتا ہے اور جب وہ ذہن انسانی کا تجزیہ تشبیہ اشعار کے ذریعہ سے کرتا ہے تو ایک شعر بے اختیار اس کے قلم سے ایسا بھی نکل جاتا ہے جسے عہد حاضر کی اشتراکیت پسندی اور سرمایہ و عمل کے تصادم کی بنیاد کہنا چاہیئے۔ کہتا ہے ؎

بروید باز دبیہ نفع کاسیان ضعیف
بہ چیں امروسے وعیبہ خواجگانِ کبار

حیرت ہے کہ مغلیہ دور ملوکیت و استبداد میں یہ خیال عرفی کے ذہن میں آئے یہ سنکر مولانا کے چہرہ پر ایک رنگ آ گیا اور وہ اس موضوع پر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ناگہاں ایک صاحب اور آ گئے اور مولانا نے گفتگو کا سیاسی

پہلو بدل کر اسے ادبی رنگ میں تبدیل کر دیا اور فرمایا کہ اس میں شک نہیں عرفی کا یہ قصیدہ اس کا شاہکار ہے اور اس کے تمام قسمیہ اشعار اس طرح سنانا شروع کئے گویا کتاب ان کے سامنے کھلی رکھی ہے۔

مولانا کا حافظہ اس فن میں ایک عجیب و غریب خداداد ودیعت تھی اور مولانا کی صحافتی و علمی زندگی کی کامیابی سب کچھ اسی انعام خداوندی کی ممنون تھی۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت جس نے الہلال کو معراج کمال تک پہنچایا وہ مولانا کا مخصوص اسلوبِ تحریر تھا۔ بہت کم ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس باب میں "ذوالریاستین" ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا کے اسلوبِ تحریر و تقریر کی دو خصوصیتیں ایسی خاص جو کبھی ان سے منفک نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بلاغت اور دوسری ان کی شانِ خطابت کہ جب ہم الہلال کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بلند منارہ پر کھڑا ہوا پُرجوش خطبہ دے رہا ہے اور ایک بے پناہ ذخیرہ الفاظ کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں مولانا ایک ایسی عجیب و غریب طرزِ تحریر کے موجد و مخترع تھے کہ نہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص اس کی تقلید کی جرأت کر سکا۔

الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا لیکن طریق ابلاغ کچھ مختلف تھا۔ تیور وہی تھے لیکن رخ دوسرا تھا، انداز وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال عصبیاتِ عملی کا درس تھا اور البلاغ عصبیاتِ ذہنی کا۔ الہلال حرکت و عمل، جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا الہلال کا پیام تھا۔

"تیرستو، شیرانہ در صحرائے تیراں باشے"

اور البلاغ کا "جلوہ بر خود کن و خود را تنگا ہے دریاب"

الہلال - صورِ منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوتِ دار و رسن اور البلاغ بشارتِ روحانی تھی اور پیامِ طاغوت شکن۔

الہلال - عرفی کی زبان میں نویدِ سرفروشی تھا کہ

برو بیازئے مومنیں تمسخر بہ مصافاں
متو گدائے شبستاں کہ تیری وتشنہ

اور البلاغ - بیدل کی زبان میں پیام تھا - "تو نے بہ جگر جمع کن و درون آ"

الہلال ایک کھلا ہوا چیلنج تھا۔ ایک بے باکانہ اعلان کہ

یارب دلانِ باغ تو یوں شبنم سحر
پروردہ رنگِ گل شکن آبگینہ ہا

اور البلاغ نہایت لطیف درس تھا اس حقیقت کا کہ

دل گم گشتہ مرا صنعت کیفیتِ شوق
نشۂ بالا گر زودت رودستیزہ ما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ الہلال نے دامنِ کتاں چاک کیا اور البلاغ نے اس چاک سے نظارۂ پرتوِ ماہ کی دعوت دی۔

الہلال مولانا کی تمام خصوصیاتِ ذہنی کا ایک ایسا رنگین گلدستہ تھا جو بیک وقت اخبار بھی تھا اور قدرِ اول کا میگزین بھی جس میں سیاسی مقالات، علمی و تاریخی مضامین، مذہبی و ادبی مباحث، لطائف، معلومات غرض وہ سب کچھ پایا جاتا تھا جس سے ہر ذوقِ انسانی آسودہ ہو سکتا ہے اور جو اپنے بعد ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پُر ہونا ممکن نہیں اور البلاغ ایک مذہبی تبلیغی آرگن تھا جس کا خطاب زیادہ تر مسلمانوں سے تھا تاکہ ان کے ذہن و دماغ سے رسم و روایات کے نقوش محو کرکے ان کو صحیح تعلیم قرآنی سے آشنا کیا جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کا حقیقی مقصود انسانیت پرستی کے سوا کچھ نہیں اور جو ماورائے دیر و حرم "ہر جا کہ ملال آستاں رسد ملما سلح" ہے۔

اس طرح ہم مولانا کے نمایاں صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو مخزن، اخبار وکیل اور لسان الصدق سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دور الہلال کا اور تیسرا البلاغ کا۔ دورِ اول خالص علمی تھا۔ دوسرا سیاسی اور تیسرا مذہبی و اصلاحی اور ان تینوں زمانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی انفرادیت و "انانیت" کا بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ میں نے "انانیت" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ ان تحریروں میں جو خود اعتمادی و کیفیتِ ایقان پائی جاتی تھی وہ صرف لفظ "انانیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے جس میں منطقی چون و چرا اور استدلالی "این و آں" کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا کے دینی و علمی مقالات کا فاضلانہ لب و لہجہ، سیاسی مضامین کا مجاہدانہ و باغیانہ انداز، مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی، سرفروشانہ رجز خوانی، مردِ مجاہد کا سا ادعائی و ایقان کا جوش، سادہ رنگ و جادو جس نے ہم کو یاد دلوائی حیات، یا جوشِ زندگی بخشا، اب کہاں؟

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

جمیل مظہری

ماتمِ آزاد

آہ اے آزاد، اے بھارت کے لعلِ شب چراغ　　آہ اے آزاد اے قومی سیاست کے دماغ
لہلہایا تیرے خونِ دل سے آزادی کا باغ　　تجھ کو تربت میں مبارک آج لمحاتِ فراغ

کارواں جائے کدھر اب رہبری کے واسطے
ذہن بھٹکے پھر رہے ہیں روشنی کے واسطے

ہند کی تاریخ کا تو مستقل اک باب تھا　　کچھ دنوں تک سب نے دیکھا کئے وہ خواب تھا
سینۂ ہندوستاں کا شعلۂ شاداب تھا　　زینتِ کرسی و زیبِ منبر و محراب تھا

کیوں نہ تجھ کو اک چمن، اک بزمِ رندانہ کہیں
اک ادارہ اک دبستاں اک کتب خانہ کہیں

تیرا ہر نقشِ ادب اک نقش پائے اعتبار　　سرمۂ چشمِ بصیرت تیری خاطر کا غبار
تیرا آہنگِ خطابت جوشِ قلزم در کنار　　کچھ سمندر کا جلال اور کچھ پہاڑوں کا وقار

نبضِ ملت میں دھڑک تیرے لبِ گفتار سے
دھڑکنیں دل کی معین وقت کی رفتار سے

فلسفے کی روح گھل کر جانِ میخانہ بنی　　شوخیٔ تحریر سے تاریخ افسانہ بنی
خامشی محفل میں کیف و کم کا پیمانہ بنی　　سینۂ دریا کی گیسوئے الہام کا شانہ بنی

ایک بے تابی حرم سے تا بہ بتخانہ ہے آج
سوزِ دل تیرا متاعِ شمع و پروانہ ہے آج

مرحبا اے ساقیٔ کیف و نشاطِ حریت　　ذہنِ مستقبل میں تجھ سے انبساطِ حریت
مرحبا اے مجلس آرائے بساطِ حریت　　کس قدر باریک و نازک تھی صراطِ حریت

پائے ہمت کو ترے دی اک خلش ہر خار نے
چن لئے کانٹے بیاباں سے تری رفتار نے

آستانوں سے اٹھائی تو نے تہذیبِ سجود   سربلندوں کو سکھائی تو نے تعظیمِ حدود
کیوں مؤرخ پہ نہ گم ہوں تیری آیات شہود   تو نے خود مقصد پہ قرباں کر دیا حبِّ نمود

روشنی کیونکر پہنچتی امرکہ میں روس میں
شمع تو جلتی رہی تا زندگی فانوس میں

وقت کو تو نے دیا اک شوخ آہنگِ خرام   جوش کو سنجیدگی، جذبات کو اک انتظام
ہند کو روحِ عمل، اُردو کو اک رنگِ کلام   راکھ کو چنگاریاں، شعلے کو اک رقصِ دوام

سوز کو اک نغمگی دی ساز کو نغمہ دیا
اب بھی کیا تاریخ پوچھے گی کہ تو نے کیا دیا

ہوگا جب تیرا کمالِ باغبانی بے نقاب   کھیت سے تاروں کے جب اُگنے لگیں گے آفتاب
تب وفا اس دل کے زخموں کا لگائے گی حساب   جس کے خون لو کا ہر قطرہ تھا تخمِ انقلاب

جس کے چھینٹوں سے ہری کشتِ چمن ہے آج بھی
جس کی سرخی غازۂ روئے وطن ہے آج بھی

ناخدا کو بھی سُلا سکتے ہیں جھونکے خواب کے   جاگی طوفانوں کی قسمت دن پھرے گرداب کے
دھمکیاں ساحل کو دیں اب حوصلے سیلاب کے   اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر احباب کے

تیرگی سی ہے دماغوں میں مناظر کی طرح
صبح کا چہرہ بھی اترا ہے جواہر کی طرح

پھر بھی تیری روح زندہ ہے کہ زندہ ہے وفا   سن رہے ہیں موت کا ہم فاتحانہ قہقہا
کیوں نہ اس بے رحم کا ہم بھی اڑائیں مضحکا   نعرۂ "آزاد زندہ باد" سے گونجے فضا

ہے طبیعت پر جو مایوسی کا زنگ اڑنے لگے
سن کے نعرے موت کے چہرے کا رنگ اڑنے لگے

اے جلوسِ آخری بیزار نگاہوں کا سلام   گرم اشکوں کا سلام اور سرد آہوں کا سلام
رہبروں کا، رہروؤں کا، شاہراہوں کا سلام   عالموں کا، شاعروں کا، کج کلاہوں کا سلام

آج وہ دن ہے کہ بھارت کا علم سجدے میں ہے
مظہری سجدے میں ہے اس کا قلم سجدے میں ہے

الہلال

ایک ہفتہ وار مصور رسالہ

AL-HILAL

Abul Kalam Azad

CALCUTTA

'الہلال' کے پہلے صفحے کا عکس

مولانا آزاد بہ حیثیت ایڈیٹر 'الہلال' و 'البلاغ'

مولانا آزاد ۱۹۱۲ء میں

محمد اجمل خاں

مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور اُن کے جواب

اگست ۱۹۴۲ء میں مولانا آزاد کو پوری ورکنگ کمیٹی کے ساتھ گرفتار کرکے راتوں رات ہندوستان میں کسی جگہ بھیج دیا گیا۔ عام افواہ یہ تھی کہ ہندوستان سے باہر کہیں بھیجے گئے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ احمد نگر کا قلعہ ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے "ہندوستان چھوڑ دو" والا ریزولیوشن پاس کر دیا تھا۔ کانگریس سے یہ امید نہ رہی تھی کہ وہ برٹش جنگ کو بلا شرط اپنی جنگ سمجھے۔

میں اور بھابی (یعنی مسز ارونا آصف علی) بھی کسی نہ کسی طرح اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ مولانا نہایت خندہ پیشانی سے اپنے ورکنگ کمیٹی کے ساتھیوں کا استقبال کر رہے تھے۔ اس لئے کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے سب سے پہلے گرفتار کئے گئے تھے اور چونکہ بھولا بھائی ڈیسائی ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے چکے تھے اس لئے وہ گھر ہی پہ رہ گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی یہاں نہیں چائے بھی ملے گی۔ میں نے ہر طرف تلاش کیا، کسی کا پتہ نہ چلا۔ ویٹنگ روم بند تھا۔ اتنے میں ایک پولیس افسر آیا اور اس نے فہرست نکالی جس میں میرا نام نہ تھا۔ لہٰذا گاڑی میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ ارونا جی بھی باہر ہی رہیں۔ کہا گیا کہ ریل میں چائے کا انتظام ہے۔ جب سب آ گئے تو دوبارہ جھنڈی دی گئی اور ریل خدا جانے کہاں چل دی۔

گوالیہ ٹینک پر والنٹیروں اور والنٹیرنیوں کی پریڈ تھی۔ وہاں مولانا آزاد یا پنڈت جی جھنڈا لہرانے اور آزادی کا ریزولیوشن سنانے والے تھے۔ ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر رضاکاروں کو نہ تھی۔ وہ سب منتظر تھے۔ ہم (ارونا جی اور میں) وہاں پہنچے۔ ارونا جی نے جھنڈا لہرایا۔ پولیس نے جس میں گورے سپاہی زیادہ تھے مداخلت کی۔ میدان کو چاروں طرف سے دھانی ٹوپیوں سے گھیر لیا گیا تھا۔ نہتے رضاکار مردوں، عورتوں، لڑکیوں اور لڑکوں پر یکایک گرد باری ہونے لگی۔ ہم نے اس تہلکہ کو دیکھ کر جلدی جلدی "جھنڈا اونچا رہے ہمارا" ختم کیا۔ اور معصوموں کو دھوئیں کی دم گھٹا دینے والی اور زہریلی تیزی سے بچانے کی کوشش کی۔ انگریز سپاہیوں نے نہتے راہگیروں کو پستول کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ دھیرو بھائی ڈیسائی اور ان کی دھرم پتنی ہم کو اور لوگوں کے پیچھے کھینچ گئیں۔ بے ہوش لڑکیوں کو اسپتال بھیجنے کا انتظام ہونے لگا اور لاشوں کے لیے

احمد نگر فورٹ جیل میں اخبار بھی بند تھے۔ آخر وہ قیدی کیوں اپنی بے بسی کے عالم میں ہندوستانیوں کے قتل و خون کے قصے پڑھیں!

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اس پس منظر کے بعد مولانا نے اپنا غم غلط کرنے یا یوں سمجھئے کہ اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ لکھنے لگے۔ مخاطب نواب صدر یار جنگ مرحوم تھے۔ خطوط سیاسی نہ تھے۔ لیکن نہ ان میں منطقی خشکی کے ساتھ تاریخی حقائق سے نتیجے نکالے گئے تھے، نہ قرآن کے فلسفے پر لکچر تھے اور اگر یہ ہوتے بھی تو کس کے لئے ہوتے۔ قلعہ سے ایک پرچہ بھی باہر نہ جا

ہو۔ ان میں سیاسی خطوط نہیں ہیں اور محض تھوڑے اقتباسات دئے ہیں جنھیں موقع محل پر شائع کیا جا سکتا ہے۔

مولانا کے نام کا لکھا ہوا ایک خط تبرکاً یہاں درج کر دیتا ہوں۔ یہ خط مولانا محمد میاں فاروقی (حال ایم پی) کو لکھا گیا تھا۔ مولانا احمد نگر جیل سے بانکوڑا بھیج دئے گئے تھے اور ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا کر دئے گئے تھے۔

دام لو اسر

بانکوڑا

۱۵- جون ۱۹۴۵ء

صدیق العزیز   جیسا کہ کل شام آپ کو ریڈیو سے معلوم ہو گیا ہوگا آج صبح مجھے رہا کر دیا گیا۔ میں آج رات کی ٹرین سے کلکتہ جا رہا ہوں۔ میں نے اس وقت ایک تار اکسپریس آفس کے نام اس مضمون کا بھیجا ہے کہ اجمل خاں صاحب بلا تاخیر کلکتہ آ جائیں۔ امید ہے کہ وہ تار ملتے ہی روانہ ہو گئے ہوں گے۔

کھڑک پور میں آپ کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی تھی۔ اس محبت و اخلاص کے لئے شکر گزار ہوں۔ افسوس ہے کہ اطمینان سے گفتگو کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس لئے چند منٹوں سے زیادہ ملاقات کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔   والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

ابوالکلام

یہ دو خط جناب اقبال شیدائی صاحب کے ہیں۔ یہ صاحب پرانے ہندوستانی نیشنلسٹ ہیں اور آج کل اپنے سوانح حیات لکھ رہے ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۵ء میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم (۱۸۷۲ - ۱۹۴۴) کابل میں تھے اور وہاں انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھر جب وہاں دو اعلیٰ ہستیوں یعنی مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ نے ہندوستانی عارضی حکومت قائم کی تو اس کے وزیر داخلہ تھے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی مرحوم (مسٹر بھوپالی نے ۱۹۲۷ء میں کیلیفورنیا میں وفات پائی)۔ مولوی محمد بشیر صاحب امیر مجاہدین سرحد وزیر جنگ تھے۔ ڈاکٹر رحمت علی (جو آج کل لاہور یونیورسٹی میں فرنچ پڑھاتے ہیں) وزیر رسل و رسائل تھے۔ مسٹر پلے وزیر خارجہ تھے (جو برلن میں نازیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے) اور راجہ مہندر پرتاپ (جو آج کل رکن پارلیمان ہند ہیں) حکومت کابل آزاد اور اعلیٰ سیاسی ہند کے صدر مدار تھے۔ اقبال شیدائی صاحب بھی وزارت جنگ و رسل و رسائل کے نائب وزیر تھے۔ ان کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کابل بھیجا تھا۔ اب وہ پاکستانی ہیں اور اتحاد اسلامی کے خواہش مند ہیں۔

یہاں علم تعلیم یا جوتش کا عالم آ گیا۔ میرے سامنے متعدد "اقبال" اپنی اپنی شان میں نظر آنے لگے۔ مثلاً اقبال محمد خاں سہیل (مرحوم) شاعر ادیب، ڈاکٹر اقبال شاعر۔ ڈاکٹر اقبال (ریڈر عربی لاہور)، سردار اقبال علی شاہ (پیر طریقت مصنف)، اقبال شیدائی صاحب انقلابی۔ سر اقبال (جج ہائی کورٹ)، اقبال سنگھ (کرکیٹ)

بسم اللہ تعالیٰ

۱۲ جون ۱۹۳۶ء

سیدی و مولائی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

یہ غالباً میرا مکتوب ہے جو خدمت عالی میں ارسال کر رہا ہوں۔ اس مکتوب کے ساتھ چند صفحات ایک خاص واقعہ کے متعلق جو اب تاریخی واقعہ ہو چکا ہے ارسال خدمت ہیں۔ دو ایک عربی اخبارات کے کٹنگ بھی بھیج رہا ہوں ممکن ہے باعث دلچسپی ہوں۔ ایک اور ضمیمہ بھی ہے جو مولوی فضل الٰہی صاحب مرحوم (مشہور) نے ہر شملہ مرحوم اور میر موسیٰ لیبی مرحوم کو لکھا تھا۔ اور جس کی کاپی مولوی صاحب مرحوم نے مجھے دی تھی۔ کسی دوسرے وقت میں ارسال کروں گا۔ یہ سب چیزیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، اور بہت ممکن ہے، ہندوستانی تاریخ نویس اس سے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔

حضور کے جواب کا ایک مدت سے منتظر ہوں۔ تاخیر غالباً گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے ہوگی۔ جواب آنے پر یہاں سے سفر کی تاریخ مقرر کروں گا۔

والسلام

حضور کا خادم

اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

قاہرہ - ۲۴، اکتوبر ۵۵ء

حضرۃ مولانا صاحب قبلہ ، سلام مسنون - مکرمی محمد اجمل خاں صاحب نے پیسے مدنی سے مکتوب کا جواب دیا کہ حضور بہر صحت و سلامت ہیں دعا ہے کہ مجھے سکون و اطمینان حاصل ہو شکریہ - مسلمان ممالک میں سکون و اطمینان کسی حساس شخص کو حاصل ہونا جوئے شیر کا لانا ہے - بہرحال مایوسی گناہ ہے -

میں ابھی یہاں کچھ روز اور قیام کروں گا - ارادہ ہے کہ اس ماہ کے آخر میں جلا جاؤں - وہاں پرانے دوست بھی ہیں - وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر کچھ تجارتی کام کروں - آخر دن کو کرنا ہے - فی الحال تو سوائے کوئی خاص مقصد نہیں - یعنی سیاسی - خدا کرے کچھ تجارتی کام چل نکلے - دعا فرمایئے گا -

یہاں مسٹر ڈیسائی ہائی کمشنر اتفاق سے مل گئے - ان کے ہاتھ ایک مکتوب خدمت عالی میں بھیج دیا - استاد مرحوم کا مرید ہوں یعنی سے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

اجمل خاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں -

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

حضور کا خادم اور دعا کا طلبگار

اقبال

یہ دو خط ایک ایسے شورش پسند کے ہیں جس کا مقصود حیات ہی حرکت و ہیجان ہے - جس نے اپنے نیمہ سندھ کے زمانے میں جیلوں تک کے انقلاب پسند نہیں بلکہ انقلابی بنا دیا - وہ ایک کوہ وقار ہے جو بچپن سے آج تک چٹان کی طرح اپنے مسلک پر قائم ہے - شمع حریت کے ان پروانوں کے سوز و گداز کو کوئی کیا جانے ، مولانا کے بعد

جو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں!

محترم المقام   سلام مسنون -

ادارۂ ہفت روزہ "چٹان" نے فیصلہ کیا ہے - کہ ۱۹۵۷ء کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جامع صفات شخصیت سے متعلق ایک خاص اور ضخیم نمبر شائع کرے - بلاشبہ ایک اعتراف ہوگا - ان علمی - ادبی - تعمیری - دینی اور سیاسی خدمات کا جو اس بزرگ ہستی نے پچھلی نصف صدی میں سرانجام دی ہیں -

ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہم اس نمبر کو مولانا کی شان کے شایان اور ان کے مذاق کی نفاست کے مطابق شائع کریں - اس ضمن میں ہم نے ان تمام اہل قلم اور اہل سیاست سے رجوع کیا ہے - جو مولانا سے قریب رہے - یا آپ کی عظمت کے کسی نہ کسی اعتبار سے معترف ہیں -

نیازکار

شورش کاشمیری

ایڈیٹر "چٹان" لاہور

بھائی اجمل

سلام مسنون آج ہی ایک خط حضرت مولانا مدظلہ کو بھی لکھا ہے ' کبھی تو ان کی نگہ التفات کو آمادہ کیجئے - ع

ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لئے

اس دفعہ سالنامہ کی ترتیب و تزئین کا اچھا خاصہ نقشہ جمایا ہے ' دو سو صفحے ، کئی تصویریں ---- سہ رنگی و یک رنگی ' پریس اپنا ہے ' آپ طباعت دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے ---- اپنے قلم کو بھی حرکت میں لایئے - مولانا مدظلہ کی سیرت کے بعض خاص پہلوؤں پر کچھ لکھئے -

یہ میری دوستانہ استدعا ہی نہیں درد مندانہ خواہش بھی ہے ' ایک بات ضرور پیش نظر رہے کہ پندرہ دسمبر تک مضمون مل جائیں ---- آپ کا بھی اور مولانا کا بھی ---- فرمایئے اُن سے کیسے التماس ہو ،

جواب کا منتظر

الملتمس

شورش کاشمیری

۹ - ۱۱ - ۵۵

جواب - کسی موقع ہو تو آپ دہلی آ کر مل لیں -

ایک ہندو سیاسی کا خط

۲۴ جولائی ۱۹۵۸ء

مخدوم مکرم جناب پیر مرشد صاحب دام ظلکم

بندہ ایک عرصہ سے آرزو خاص دل میں پوشیدہ رکھتا تھا کہ جناب کی خدمت میں چند حروف ارسال کروں مگر بوجہ دیر دیگر مجبوریاں تھیں۔ آج خوشی سے تحریر کرتا ہوں اُمید قوی ہے کہ جواب دے کر بندہ پر بڑی عنایت کریں گے تاہم ڈر بھی ہے کہ ایک ملک کا اتنا بڑا آدمی کہ غریب فقیر لوگوں جو اُس کے بلند خیالی دیک واسی کا سہرہ لوح و سیارہ سر سو پھیلا ہوا ہے اس لئے ایسا۔

آج میں نے ہندی کی منتر و شاعری کی ایک کتاب پر غور کیا جس میں ملک محمد جائسی کے تعارف اشعار تھے۔ ایک ہندی ساہتے ان کو "صوفی" لکھا جس کو میں بھی مانتا ہوں اور ہر شخص مانے کو تیار ہے۔ مگر مذکورہ کتاب کے اندر "صوفی" الفاظ کی تشریح نے مجھے پریشان کردیا۔ بعض اشخاص نے تو صوفی اس جماعت کا نام لکھا ہے جو سفید اون کے کپڑے پہنتے تھے۔ بعض کہتے ہی الفاظ بیٹھنے والے تھے۔ کیا میں امید کروں کہ وقت سا سب سے نکال کر مجھے ان الفاظ میں صوفی الفاظ کے مترادف الفاظ و نیز اس جماعت کی ابتدا نے تواریخ پر چند حروف عنایت فرمائیں گے۔

میں ایک ہندو فقیر (سیاسی) ہوں اور اردو ہندی دونوں سے پریم ہے۔ امید ہے حروف غلط و نیز دیگر غلطی پر غور نہ کریں گے۔ مجھے یہ سہو نامعلوم کیوں پسند ہے۔

ہزاروں بندے ہیں خدا کے جو یوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ ہوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

آپ کا خیر اندیش

سوامی برہم دت ہنس

جواب:- میرا خیال ہے کہ یہ لفظ یونانی لفظ صوفیونان سے نکلا ہے جس کے معنی حکمت و عقل ہیں۔ اس سے فیلا سوف بنا ہے۔ قطعی طور پر کہنا مشکل ہے لیکن یہی خیال زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

دانی کھیت ضلع المورہ

۱۰ ستمبر ۱۹۵۸ء

فضیلت مآب قبلہ مولانا صاحب مدظلہٗ

آداب! آپ پر کوئی راز مخفی نہیں ہے کہ نوٹس اور نوجوانوں کے لئے شیخ سعدی کی مشہور و مستند تصنیف کریما سے بہتر کتاب آج تک کسی زمان میں شائع نہیں ہوئی۔ خوش قسمتی سے اس لطیف کتاب کے ہندی ترجمہ کی ایک جلد میرے پاس موجود ہے جو غالباً ساٹھ ستر سال ہوئے دہلی میں چھپی تھی۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ محکمۂ تعلیم یا کوئی اور شعبۂ تعلیم اس ترجمہ کو چھپوا کر شیخ سعدی کے پند و نصائح سے اہلِ ہند کو مستفیض کرے۔ شرط طلب یہ ہندی کتاب یہ سر دست ارسالِ خدمت ہوگی۔

کچھ عرصہ ہوا ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ انگریزوں کے عہد میں جب آپ احمد نگر کے قلعہ میں سلطانی مہمان یا حاکم بدہن اسیر تھے تو ایک حیدریا سے جو آپ کے کمرہ میں مخل ہو کر باعثِ تکلیف ہوتی تھی آپ کو دوچار ہونا پڑا کیونکہ اس کو مداخلت سے روکنے کی تمام تدبیریں بےکار ثابت ہوئیں۔ مبادا موجودہ سیاسی عہدہ میں پھر حالات ایسی رونما ہو جائیں یہ تجویز پیشِ خدمت ہے کہ آئندہ آپ کے سپتہ وزارت میں ایک دیرکا گیتدیبی اضافہ کر دیا جائے جو بوقتِ ضرورت ایسے مدعلیس سماج کے تدارک و اندفاع میں تیرو تفنگ تو کیا اب اور بومریگ (Boomrang) سے بھی زیادہ موثر ہوگی۔

چونکہ میں مہاجر اور دور ہوں اس خدمت کے اجر کا بھی مستحق ہوں اور اجر بھی تجویز کر دیتا ہوں۔ وہ ہوا ملا۔ مجھے دو غزلوں کی نقلیں جن کے ایک ایک مصرع ذیل میں منقول ہیں عنایت فرمائی جائیں۔ ان کے حصول میں میں اب تک ناکام رہا۔

۱۔ میاور کشتی وچشم نسیمی وسیر دریا کن

۲۔ منم آن شیخ تنہائی کہ در ویرانہ می سوزد

پھر مغلیہ بادشاہوں کے مشہور عالم باغ موسومہ شالامار کے صحیح نام اور وجہِ تسمیہ سے بھی مطلع فرمائیں۔ یاد پڑتا ہے کہ وقائع نعمت خاں عالی میں مذکور ہے کہ اس کا اصل نام شعلہ ماہ باغ تھا۔ براہِ کرم اس کی تحقیق و

تصدیق فرمائیں۔ اخبار Blitz نے اس سے متعلق ایک غلط بیان شائع کیا ہے اس کی تصحیح اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

دعا گو و محتاجِ دعا
نیاز مند
سری کرشن داس رس خراب آبادی

جواب - پہلا مصرعہ آتشی قندھاری کا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ذکر کیا ہے اور یہ مطلع لکھا ہے۔

شالامار کے بارے میں کئی رائیں ہیں لیکن صحیح وجہ تسمیہ نہیں بیان کی جا سکتی۔ شالامار باغ دلّی میں بھی تھا اور نگ زیب نے اپنی تخت نشینی کا وہیں سے اعلان کیا تھا۔ لیکن اب اس کا نام نشان باقی نہیں ہے۔

مکرم و محترم چودھری غلام رسول مہر (سالِق اڈیٹر "انقلاب" لاہور) اردو کے بہترین ادیب، فارسی کے رمز شناس، عربی اور انگریزی ادب کے قدر داں، کا مولانا سے بہت قدیم یارانہ ہے۔ سیاسی رہبروں نے اس رشتہ کو ٹھیس نہیں دی مگر مزید استواری بخشی۔ لاہور میں اُن سے مولانا کی ملاقاتیں بھی مجھے یاد ہیں اور تقسیم کے بعد مہر صاحب کا دلّی میں مولانا کے یہاں فروکش ہونا بھی کل کی بات ہے۔ ان کے خطوں پر جو مولانا کے جواب ہیں وہی ناہمی محبت، خلوص کے لئے شاہد عدل ہیں۔

باسمہٖ سبحانہ

۲۲ - مارچ ۱۹۵۷ء

برادرِ محترم - میں نے جب آپ کو لکھا تھا کہ جلد آ رہا ہوں تو اسی وقت تیاری کر لی تھی لیکن دفعتاً بیمار ہو گیا اور اب تک بیماری سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ ذرا طبیعت سنبھلے تو چند روز کے لئے حاضر ہو جاؤں۔ بعض ضروری باتیں پیشِ نظر ہیں۔ مئی میں یورپ جانا چاہتا ہوں۔ غالب ہے اس سفر میں چار پانچ مہینے لگ جائیں۔

یہاں پنجاب یونیورسٹی ایک دائرۃ المعارف مرتب کر رہی ہے۔ اس کے لئے حضرت مولانا کے متعلق ایک مقالہ میرے ذمے لگا ہے۔ وہ تمام حالات میرے پیشِ نظر ہیں جو مولانا نے اپنی تصانیف میں صراحتاً لکھے یا دوسرے احباب نے متعلق کتابوں میں تصنیف کرتے وقت تحریر کئے۔ بعض امور کے متعلق تعین کے ساتھ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کیا آپ ازراہ عنایت میرا عریضہ مولانا کو سنا کر جوابات لکھنے کی زحمت گوارا فرما لیں گے؟ یہ مقالہ چونکہ دائرۃ المعارف میں چھپے گا اس لئے تمام معلومات زیادہ سے زیادہ واضح اور مستند ہونی چاہئیں۔ مثلاً

۱ - مولانا کا سالِ ولادت ۱۳۰۵ھ ہے لیکن صحیح تاریخ اور دن کے متعلق کہیں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۲ - "لسان الصدق" کا پہلا پرچہ ۲۰ - نومبر ۱۹۰۳ء کو نکلا تھا یہ پرچہ اور متفرق پرچے میرے پاس ہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کب تک جاری رہا؟

۳ - "الندوہ" کی ایڈیٹری کا زمانہ ۱۹۰۵ء کے اواخر سے ۱۹۰۶ء کے اوائل تک کا معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس تعلق کی صحیح تاریخیں معلوم ہو سکتی ہیں؟

۴ مولانا "وکیل" میں کب سے کب تک رہے؟

۵ - مولانا کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ عراق کا سفر ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ کیا اس کی صحیح تاریخ اور مدت کا علم ہو سکتا ہے؟ مولانا کے بھائی کا انتقال کس مقام پر ہوا تھا؟

۶ - مختلف لوگوں نے لکھا ہے کہ مولانا بہ سلسلۂ تعلیم مصر بھی گئے تھے۔ یہ سفر کس زمانے میں ہوا تھا؟

۷ - مولانا کے والد ماجد ۱۹۰۸ء میں حجاز گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر کیا تھی؟

۸ میرا خیال ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہے۔ اس لئے کہ بمبئی، بنگال، برما وغیرہ میں ان کے بے شمار مرید تھے۔ مستقل اقامت کی نیت سے ۱۸۹۸ء میں آئے۔ کیا یہ درست ہے؟

۹ مولانا کے والدین کی تاریخ ہائے وفات؟ میں نے ۱۹۲۲ء میں ان کی قبروں کی زیارت کی تھی اور تاریخیں لکھ لی تھیں، لیکن اب وہ تحریر کہیں کاغذوں میں گم ہو گئی ہے اور نہیں ملتی۔

۱۰ - رانچی میں مدتِ قیام کو "نظر بندی" سے تعبیر کرنا درست ہو گا یا "اسیری" سے۔ مولانا نے "غبارِ خاطر" میں اس مدت کو "اسیری" میں محسوب کیا ہے۔

میں نے بڑی ہمت کر کے یہ سطریں لکھی ہیں۔ لطفاً یہ بھی لکھئے کہ مولانا کی صحت اب کیسی ہے۔ مجھے ہر حال میں جلد آنا ہے۔ صرف اس انتظار میں ہوں کہ ذرا طبیعت

مشغول ہو جائے تاکہ سفر کے قابل ہو جاؤں۔

امید ہے آپ بخیر ہوں۔ سید صاحب کی سیرت کی جلد اول کے پروف دیکھے گئے۔ دوسری جلد کے پروفوں کا منتظر ہے کتاب انشاءاللہ جلد چھپ جائے گی۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

نیاز مند

مہر

جواب۔ بہتر ہے کہ آپ دو تین دن کے لئے یہاں آئیں تو ان سوالوں کے زبانی جوابات مل جائیں۔

باسمہ سبحانہٗ

سنہ ۱۹۵۲ء

حضرت مولانا۔ میں کل ایک مخلص عزیز عبد الحمید خاں صاحب کی وساطت سے ہدیۂ تحریک میں بھیج چکا ہوں آج وہ پیرکوٹ تو معمول کے مطابق سب سے ہے آپ ہی کی یاد تازہ ہوئی۔ میں نے عرض کرنا معمول گیا کہ عرفی کا ایک شعر آپ نے اسرار خاطر میں کسی قدر بدل کر دیا ہے اور بدلا ہوا ٹکڑا اصل سے بہتر نہیں۔ اور فکر کے باوجود معلوم نہ ہو سکا کہ اس میں مصلحت کیا تھی شعر یوں ہے۔

من از بیں دردِ گراں مایہ چہ لذّت یابم
کہ باندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

شعر فی نفسہٖ میں "دردِ گراں مایہ" کی جگہ "رنجِ گراں بار" چھپ ہے
یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ نے شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر کسی جگہ لکھا تھا کہ آیا اس کا دیوان چھپ چکا ہے؟ آیا اس بحرہ کا کوئی ٹکڑا آپ کے مسودات میں موجود ہے؟ لیکن اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ دلی دوبارہ تو نہ یہیں ہوں۔

والسلام علیکم

نیاز مند

مہر

جواب۔ ہو سکتا ہے کہ میرے حافظے میں وہی الفاظ ہوں جو میں نے لکھ دیئے۔ اگر آپ نے دیوانِ عرفی دیکھا ہے تو وہی الفاظ ٹھیک ہیں
شرف جہاں قزوینی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری میں وقوعہ گوئی کے طرز کی بنا ڈالی، وقوعہ گوئی اس معاملے میں بولا جاتا ہے جس معنی میں اردو میں معاملہ بندی کہتے ہیں۔ اس کے مسودات ضائع ہو گئے موجود نہیں ہیں۔

خان بہادر ظفر حسین خاں کی موٴلفہ کتاب "انواع فلسفہ" چھپ گئی ہے مولانا نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے دیکھ کر فرمایات وہ کیا وقیع ہے!

"انواع فلسفہ میں آپ نے بعض مصطلحات ایسی استعمال کی ہیں جو غور طلب ہیں۔ آپ نے Resultant کے لئے معلولات استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا Resultant ریاضی کی مشہور اصطلاح ہے جس کے لئے صحیح عربی لفظ حاصل ہے۔ Emergent کے لئے آپ نے بروزات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ خروج اس کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا میں نے الہلال کے زمانے میں اس کے لئے ظہور نمو کا لفظ استعمال کیا تھا لیکن پھر میں نے اس سے زیادہ موزوں عربی لفظ پایا جو علت کی ضد ہے۔
Atom کے لئے آپ نے ذرہ استعمال کیا ہے۔ ٹھیک ہے لیکن عربی کی پرانی اصطلاح جوہر فرد ہے

آپ نے Dialectic کے لئے کلامیات وجدلیات دو لفظ لکھے ہیں۔ کلامیات اس کے لئے درست نہیں ہوگا۔

Experimentalism کے لئے آپ نے اختباریت استعمال کیا ہے۔ جو بھی لفظ استعمال کیا جائے اس میں تجربہ کا مفہوم آنا چاہیئے آپ نے Mass اور Quantity کو مرادف قرار دیا ہے اور دونوں کے لئے کمیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس کے لئے صحیح لفظ حجم ہے نہ کہ کمیت۔ الہلال کے مضامین میں میں نے ماس کے لئے حجم ہی استعمال کیا ہے

آپ نے Platonic Ideas کے لئے افلاطونی اعیان کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہمارے مترجموں نے اس کے لئے مثال کی اصطلاح استعمال کی تھی اور وہی صحیح ہے۔ عین کا عربی فلسفہ اور تصوف میں دوسرا مفہوم ہے
Response کے لئے آپ نے جوابی حرکت اور ردّ عمل دو لفظ لئے ہیں ردّ عمل Reaction ہے Response کے لئے صرف جواب صحیح اصطلاح ہوگی۔

Self کے لئے آپ نے ذات اور بعض جگہ لفظ نفس لکھے ہیں۔ مفردات استعمال کیجئے۔ لفظ نفس صحیح نہیں ہوگا۔ اگر Self کے لئے نفس استعمال کریں گے تو Nous کے لئے کیا باقی رہے گا۔ عربی فلسفے میں Noetic کے لئے نفس ناطقہ استعمال کیا گیا ہے۔

Velocity کے لئے آپ نے حرکت کا لفظ لیا ہے۔ پھر آپ Movement کو کیا کہیں گے۔

Proton کے لئے آپ نے برقی مثبت کی اکائی لکھا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس قسم کے تمام انگریزی مصطلحات جو ہمارے لئے سہل الحصول ہوں بجنسہ اختیار کر لینے چاہئیں۔ اردو میں Electron اور پروٹون ہم کہہ سکتے ہیں

Pluralism کے لئے آپ نے کثرتیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہوگا۔ اسے مذہب کثرت کر دیجئے۔

• •

شری دیانند شرما کا سوال اور اس کا جواب

دہلی ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء

مخدوم مولانا صاحب

معاصر امروز، لاہور نے آپ کا مضمون "اسوۂ حسین" ماخوذ از "داستان کربلا" (شکریہ لعیس اکیڈمی) اپنے مورخہ ۱۴ اکتوبر کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ ایڈیٹر لکھتا ہے کہ ہم مولانا نے موصوف سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ اس موقع پر مسلمانانِ کشمیر کو بھی یہی مشورہ دیں گے کہ وہ "ہر ظالمانہ وجابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کریں اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت وفرمانبرداری کی بیعت نہ کریں جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت اور حقوق کی غارت گر ہو۔"

قطع نظر اس کے کہ معاصر ایسا کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ میں ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا نظریہ کیا ہے۔ کیا یہ خدا کی بخشش ہیں جیسا کہ آپ کے مضمون میں درج ہے یا انسانی دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ مجھے راہ دکھا سکیں تو آپ کا بہت شکرگزار رہوں گا۔

خادم

دیانند شرما

جواب:- جو چیز قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مساوات پر یعنی انسانی برادری تو بھائی چارہ "پیغام طور سے اس میں زور دیا گیا ہے لو اس خیال کی مخالفت کی گئی ہے کہ معاشرت یا نسل کی بنا پر انسان کا کوئی گروہ دوسرے گروہ سے افضل ہو سکتا ہے۔

مساواتِ انسانی کا یہ تصور فطری ہے اور خدا کی بخشش ہے۔ دی گئی اس کے حصول کی کوشش یا عدم سعی۔ یہ انسانی دماغ پر منحصر ہے۔ فطرتِ صحیح اُسے راستہ دکھا چکی ہے۔ اس پر چلنا یا نہ چلنا اس کے اختیار میں ہے۔

مکتوب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب ڈائرکٹر دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدرآباد

۲۳۔ اگست ۱۹۵۶ء

مخلصی ومحترمی

تسلیم۔ آپ کے الطاف نامہ مورخہ ۱۴۔ اگست کا بے حد مشکور ہوں۔ حضرت مولانا کی خدمت میں تمام علمی دنیا اور خصوصاً دائرۃ المعارف کی جانب سے ہدیۂ تشکر پیش فرمائیے اور عرض کیجئے کہ آپ کے عہد اور آپ کی سرپرستی میں جو کام ہو رہے ہیں وہ ابد الآباد تک زندہ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ آپ کو ان کا اجر دے گا اور یہ کارنامہ تاریخ ثقافت عالم میں زرّیں حروف سے لکھا جائے گا۔ دائرۃ المعارف کی سرپرستی درحقیقت ہمارے مشاہیر کی سچی قدردانی ہے۔ کتاب الہند جس کا ملنا مشکل تھا وہ بھی حضرت مولانا کے فیض سے عالم تحقیق کو کر دستیاب ہو جائے گی اور ہندوستان اور بیرونی کا نام پھر روشن ہو جائے گا۔ پہلے یہ حرف مکرر ملحوظ ہیں۔

میری شخصی استدعا مورخہ ۱۴۔ جون ۱۹۵۶ء کے متعلق کیا کارروائی عمل میں لائی گئی کچھ نہیں چلا۔ دو حرفی جواب سے سرفراز فرمائیے کیونکہ یہاں حالات بہت جلد تبدیل ہو رہے ہیں۔

منتظر کرم

محمد نظام الدین

جواب:- کتاب الہند کی طباعت واشاعت یقیناً ایک علمی وثقافتی کارنامہ دائرۃ المعارف کی شہرت ہندوستان کی شہرت ہے۔ حیدرآباد کے ایکشن کے زمانے میں متعدد استفسارات بیرون ہند سے اس ادارے کی سلامتی کے متعلق وصول ہوئے تھے۔ آپ کے ذاتی مسئلہ پر غور ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر نور حسین صاحب کا سیالکوٹ (پاکستان) سے مکتوب

سیالکوٹ - ۴ ستمبر ۱۹۵۸ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ایک مدت سے ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں عریضہ لکھوں - چند ایک مسائل ہیں جو میرے لئے ایک مدت سے الجھن بنے ہوئے ہیں - آج میں آپ ہی کی خدمت میں ان کے حل کرنے کے لئے رجوع کر رہا ہوں کیونکہ میری دانست میں ان مسائل کی دشواریوں کو طے کرنے کی اہلیت سرزمین پاکستان و ہند میں آپ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں رکھتا - لہٰذا آپ ہی کو تکلیف دے رہا ہوں - میں جانتا ہوں کہ آپ کی مصروفیتیں بے حد ہیں - لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اور کوئی راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا -

اسلام کی ہمہ گیر سادگی اور یہ کہ یہ فطرت کا مذہب ہے - مسئلہ توحید اور اس کے بعد عمر عمل صالح پر زور - یہ سب کچھ نہایت عمدہ اور قابل قبول - لیکن اس کا کیا جواب کہ تاریخ کے اعتبار سے (قرون اولیٰ کے شاندار زمانہ سے قطع نظر) سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں کہ ہم بارھویں صدی عیسوی یا خلافت عباسیہ کے خاتمہ کے بعد اسلام کی تمام ترقی کا در وازہ ایسا مسدود ہوا کہ پھر نہ کھلا - اور آج تک پیروان اسلام ذلت و ادبار میں مبتلا ہیں میں اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہوں کہ اسلام اور پیروان اسلام دو مختلف چیزیں ہیں - اور دونوں کو خلط نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ چیز معمہ بن چکی ہے کہ اتنی اچھی تعلیم کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے اس قدر پست ہے اور کیوں - تہذیب و تمدن، اقتصادی مرفہ الحالی، خدمت علم و سائنس، وراثت فی الارض، انسانیت اور اس کے جملہ خصائص انفرادی اور اجتماعی، ان سب چیزوں میں مسلمان سب قوموں سے پیچھے ہیں اور بظاہر کوئی صورت اصلاح حال کی دکھائی نہیں دیتی - مغربی ممالک کی نظروں میں مسلمان محض ایک مذاق بن کے رہ گئے ہیں - اس کے برخلاف دوسری اقوام کو دیکھا جائے تو وہ ہر چیز میں ہم سے پیش پیش ہیں - خدمت خلق، راستبازی، بلند اخلاق ان چیزوں کا ان اقوام کے اندر اس قدر دور دورہ ہے کہ حیرانی ہوتی ہے - علم و فن کے میدان میں

" ہم سے پیش پیش ہیں -

اسی سلسلے میں ایک چیز نے بظاہر میری رہنمائی ضرور کی ہے اور وہ یہ کہ جب سے اس دنیا میں آج تک سر اٹھایا مثلاً بابلی، کلدانیوں کی تہذیب، ہندوستان میں آریاؤں کی تہذیب، مصریوں کا عروج و ترقی، یونانی اور رومی تہذیبیں - یہ سب اپنے اپنے زمانے میں انتہائی عروج پر پہنچیں اور پھر ان کا زوال ایسا آیا کہ پھر نہ ابھریں - تو کیا فطرت کا یہ ازلی قانون تو نہیں کہ جو قوم یا تہذیب ایک انتہائی بلندی پر پہنچ جائے اس کی پستی لازمی اور یقینی ہے - اور پھر وہ نہیں ابھرتی - بجنسہٖ یہی اسلام کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا -

ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کے ماتحت تو ایسا نہیں ہو رہا لیکن قرآن حکیم میں بھی تو لکھا ہے کہ ھُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ - تو اس کے ماتحت اس دین کو سب پر غالب ہونا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہو رہا -

اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ جو ذلیل اور پست حرکتیں ہیں - وہ مسلمانوں کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں - حالی مرحوم جس قدر برائیاں گن گئے تھے ان سے کئی گنا زیادہ اب موجود ہیں - آج کے مقابلہ میں شاید وہ دور بہتر تھا - شرافت، دیانت، تحمل، وسعت قلبی، ایثار، رحم، سچائی، عدل و انصاف، ان سب خصائص سے ہمیں دور کا بھی تعلق نہیں - نفرت، خود غرضی، ظلم، بددیانتی، تنگ نظری یہ سب ہمارا شیوہ بن چکی ہیں تو خدارا بتلائیے کہ ایسا کیوں ہے اور کیا کوئی اصلاح حال کی امید ہے -

جو میرے شکوک و شبہات ہیں وہ یہ ہیں کہ قرآن و سنت کے صحیح اور سیدھے راستے کی موجودگی میں مسلمانوں کی تمام عالم اسلام میں یہ حالت کیوں ہے - مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک کی حالت شاید ہم سے بھی زیادہ زبوں ہے تو آخر ایسا کیوں ہے - کیا نعوذ باللہ اسلامی تعلیم میں وہ دلکشی ختم ہو گئی اور محمد علی باب کے مطابق کہ ہر مذہب ایک ہزار سال کے بعد اپنی اصلی ماہیت کھو بیٹھتا ہے یہی اطلاق ہمارے اوپر تو نہیں - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کا ذکر آپ نے تذکرہ میں جو کیا ہے وہ تو مایوس کن ہیں - لیکن ہم امید کرتا ہوں کہ آپ کی ہدایت ہوگی - ان امور کا جواب دیجئے اور ضرور وقت نکالیے - میں پرانا نیازمند ہوں اور تسکین قلب کی تلاش میں ہوں -

آپ کا ادنیٰ نیازمند

نور حسین

جواب: - اسلام دین فطرت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خود اسلام کی تعلیم کو پرکھا جائے - باقی رہی یہ بات کہ لوگوں میں بے عملی کیوں ہے اس کی ذمہ داری اسلام کی تعلیم پر نہیں ہو سکتی

لوگوں کی بدعملی پر ہے۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اس تعلیم کے جو کامیاب نتائج نکلے وہ بھی ہمارے سامنے ہیں اور اس لوگوں کے بدعملی کے نتائج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔

غلامی کے متعلق ایک استفسار

رانچی چوپچ مٹھ
۴- اگست

ذوالمجد الکریم حضرۃ مولانا محترم، ادام اللہ بقائکم ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ، ایک مسئلہ کی تحقیق کے لئے بصورت تحریر حاضر خدمت ہوا ہوں۔

آپ نے اپنے ترجمان القرآن میں ' ما ملکت ایمانکم ' کے لئے نکاح فرض قرار دیا ہے اور بغیر نکاح وطی "ناجائز" ہے اور اس کی وضاحت آپ نے دوسرے حصہ سورۂ مومنون کے نوٹ کے اندر کی ہے کہ "قرآن کے نزدیک اتحاد و تناسل کا جائز طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ازدواج کا طریقہ ہے اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا ناجائز ہوگا خواہ کسی شکل اور کسی نوعیت کا ہو۔" حالانکہ آیاتِ قرآنیہ سے اس کا صاف طور سے ثبوت نہیں ملتا ہے ہاں، اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ وہ لونڈی کسی دوسرے کے ملک میں ہو تو مالک سے اجازت لے کر اس کا نکاح کیا جائے گا جیسا کہ آیت شاہد ہے ' فانکحوھن باذن اھلھن ' اور دوسری آیت ' وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ' سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور اس سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو تو دوسرے سے اس کا نکاح کر دے۔

اور سورۂ مومنون میں " الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت ایمانھم " سے تو صاف طور سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بغیر نکاح لونڈی سے وطی کرنا جائز ہے کیونکہ آیت ازواج اور ما ملکت ایمانھم کے حق وطی میں ظاہر ہے اس لئے کہ عقدِ مناکحت کے بعد ملک یمین بھی ازواج میں داخل ہے تو پھر دوبارہ ملک یمین کا تذکرہ کیوں ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد عورت بیوی اور لونڈی سے وطی جائز ہے۔ اس آیت کے علاوہ فتاویٰ عالمگیری و بخاری و قاضیخان وغیرہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ملک یمین سے بدون نکاح وطی جائز ہے اور اس دورِ حاضرہ میں حجاز کے بادشاہ سلطان ابن سعود کا بھی اسی پر عمل ہے اور ہمارے شہر کے علماء بھی قرآن و حدیث اور دلائلِ عقلیہ کی روشنی میں اسی کو ثابت کرتے ہیں کہ شرعی لونڈی بغیر نکاح وطی جائز ہے اب میں حیران ہوں کہ صحیح مسئلہ کس کو سمجھوں۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت قرآن، حدیث و واقعات کی روشنی میں فرما دیجئے تاکہ پیدا شدہ شکوک و شبہات رفع ہو جائیں۔

راقم نیازمند
محمد نعیم

جواب۔ مختلف موقعوں پر مختلف نوعیت کی تصریحات ہیں۔ لڑائی کے قیدیوں کی نسبت عام رواج یہ تھا کہ وہ لونڈی غلام بنالئے جاتے تھے۔ اسلام نے ابتدا میں رحم و شفقت کے احکام دے کر اس رسم کے تنازعہ کو کم کیا اور پھر سورۂ محمد کی آیت ' فاما منا بعد واما فداء ' نازل کر کے اس رسم کو بھی بند کر دیا۔ البتہ اس سے پہلے جو لونڈیاں لوگوں کے تصرف میں آچکی تھیں ان کے تعلق کو باطل نہیں کیا۔ سورہ مومنون میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سرمد شہید کے متعلق استفسار

لاہور

گرامی قدر جناب،

السلام علیکم۔ قافلے چلتے رہیں گے اور انسانی فکر میں بھی ترقی رونما ہوتی رہے گی اور چند ایسے انسان بھی قرطاسِ عالم پر ابھریں گے جو اوراق پارینہ سے زندگی حاصل کریں۔ مجھے بھی انہیں میں سے ایک فرض کر لیجئے۔

سرمد کی ذات، عظمت اور ارشادات پر کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب "خون شہادت کے قطرے" نظر سے گزری تو دل نے کہا کہ آپ اس سلسلے میں میری معاونت کر سکیں گے۔ براہ کرم مجھے وہ کتب اور رسائل تجویز فرمائیے جن کا مطالعہ مجھے منزلِ مطلوب تک لے جائے۔

آپ کی عدیم الفرصتی کے باوجود جواب ملنے کا یقین رکھتا ہوں۔ فقط

آپ کا خیر اندیش
کرم الٰہی بدر

جواب۔ فارسی شعراء کے جو تذکرے ہیں اکثر میں مختلف حال موجود ہے۔ بخصوص ہندوستان کے تذکروں میں مراۃ الخیال میں کسی قدر تفصیل ملتی ہے۔ دبستانِ مذاہب میں بعض تفصیلات ملیں گی۔ نیز کتاب پیدائش کا فارسی ترجمہ بھی سرمد کی نگرانی میں ہوا۔

خواجہ غلام السیدین

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

مولانا آزاد کا ذکر کن لفظوں میں کروں اور جذبات کی یورش کو کس طرح دماغ کا تابع بناؤں۔ ان کی عظمت کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب وقت تاریخ کی کسوٹی پر ان کے ہم عصر مشاہیر کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو پرکھے گا۔ ہم لوگ جو ہمالہ کے دامن میں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں کیا اندازہ کر سکتے ہیں اس کی بلندی کا، اس کی برف پوش چوٹیوں کا جن پر سکون کی ایک ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی ہے، اس کے دل کی حرارتوں کا جس میں لاوا کھولتا رہتا ہے، ان طوفانوں کی یورش اور بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں پلتی ہیں یا جواہرات کے ان خزانوں کا جو اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں؛ اس مختصر مضمون میں تو بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ ان کی عہد آفریں شخصیت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دوں۔

ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گود میں پل کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور اپنی خاص قدریں، خاص اصول، نیک و بد کے خاص سانچے ڈھال لیتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا سنگم ہے جس کے بنانے میں مختلف قوموں، نسلوں، زبانوں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے۔ اور اس کا ارتقائی سلسلہ ہزاروں برس سے قائم ہے۔ قدرت کی فیاضی سے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام یا بہت سی اچھی قدریں کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہیں جیسے اٹلی میں لیونارڈو ڈی ونچی، جرمنی میں گوئٹے، امریکہ میں ابراہیم لنکن، ہندوستان میں ٹیگور، گاندھی اور مولانا آزاد اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گذشتہ ہزار برس میں پروان چڑھی ہے۔ انھوں نے مشرقی تہذیب، ادب اور علوم، فنون کے ماحول میں ابتدائی تربیت پائی، مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح اس کی بہترین قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوئے۔ ان کی خلاق طبیعت نے اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی بہترین قدروں کو بھی اس طرح اپنایا کہ ان کی ذات مشرق و مغرب کا ایک حسین سنگم بن گئی۔ اس میں ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، رواداری اور وضعداری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی، ذہنی جرأت، سائنٹفک عقلیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس طرح ان کی ذات ماضی اور حال کے درمیان، مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کا کام کرتی تھی۔ وہ ایک زبردست عالم دین تھے لیکن ملا کی تنگ نظری سے آزاد۔ فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن کبھی اس کی سطحی موشگافیوں میں راستہ نہیں بھٹکے۔ ان کا مسلک گویا یہ تھا ؎

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

ان کے مذہب، فلسفہ، سائنس، سیاست سب کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈھالے اور اس غرض کے لئے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی قوتوں کو پورا فروغ دے۔ ان کی زندگی میں دین اور دنیا کی تفریق نہ تھی، دونوں میں حق پسندی اور شرافت کے اصولوں کی کارفرمائی تھی۔ وہ ایک مدبر اور بیدار مغز سیاست دان تھے لیکن ان تمام ریشہ دوانیوں اور گھٹیا چالوں سے بلند جن کے ذریعہ بہت سے سیاست کا کھیل کھیلنے والے اپنی قوت اور اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم اور ملک کے دل میں اپنی جگہ پیدا کی تھی لیکن اس کے لئے کبھی اشتہار بازی کے طریقوں سے کام

نہیں لیا۔ وہ کبھی عوام کی سطح پر نہیں اُترے، بلکہ محبت اور ہمواری کے ساتھ انہیں اسی سطح پر لانے کی کوشش کی اور جب کبھی وہ راستے سے بھٹکے اور مولانا کی طرف سے انھوں نے بدگمانی یا روگردانی کی، مولانا صراطِ مستقیم پر چلتے رہے اور عملی اور ذہنی اپنے فرض کو یکسوئی اور دل سوزی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ سیاست کے طوفان آئے، بڑے بڑوں کے پہاڑوں کے سے ثبات قدم کو لڑکھڑا دیا لیکن یہ مردِ مجاہد، یہ کوہِ وقار مومن اپنی جگہ پر اپنے اصولوں پر، اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا، اس شان کے ساتھ کہ ستائش کی تمنا رہنے کی پروا، نہ مخالفوں اور بد باطنوں کی ملامت کا خوف اور شکوہ۔ ان کی درشت و تہی اور بدزبانی کو اس طرح برداشت کیا کہ پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ کہا تو اتنا کہا کہ یہ کیسے احسان ناشناس ہیں، نہیں جانتے، نہیں سمجھتے کہ ان کی حرکتوں کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔ اُن کے دل میں کینہ کے لئے جگہ ہی نہ تھی۔ انھوں نے کسی جگہ ظہوری کا ایک شعر نقل کیا ہے جو اُن کے قلب صاف کا نقشہ کھینچتا ہے

ز بسکہ سینۂ ظہوری پُر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

اُن کا معاملہ قوم کے لئے بھی اعتمادیت اور شرافت کا ساتھ دو اور بے ایمانی اور بے انصافی کے ساتھ رشتہ نہ جوڑو۔ خدا کی رسی کو جو حق اور صداقت کی رسی ہے، جو سیدھا راستہ ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ اور خود انھوں نے عمر بھر کبھی اس حبل المتین کو اس مضبوطی سے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی غلطی اور بے انصافی میں؟ اصول کا ساتھ نہیں دیا۔ کبھی صحیح اور سچی بات کہنے میں غیروں سے پہلو تہی نہیں کی۔ ان کے لئے اپنے وہی تھے جو ان کے اصولوں سے متفق ہوں اور غیر وہ جو ان اصولوں کی مخالفت کریں۔

قدرت نے انہیں ایسا دور رس دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سلجھا دیتے تھے اور اس کا ناخنِ تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی حال دفتر کے کاموں میں تھا۔ ہم لوگ معاملے کی جزئیات میں اُلجھتے، موافق اور مخالف دلیلوں کا ڈھیر لگاتے لیکن ان کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ معاملہ تک پہنچ جاتی اور وہ ایک واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ ان کا دل آئینہ تھا۔ اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے سارے اجزا انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ان پر تمام اقلیتوں کو پورا پورا بھروسا تھا اور وہ جانتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی برائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سنا کہ فلاں "چھوٹے دل و دماغ کا آدمی ہے" یعنی ان کی ترازو میں دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلت تھی!

انھوں نے جنگِ آزادی کے زمانے میں اس تحریک کی سرداری کی اور قید و بند کی مصیبتوں اور قربانی اور ایثار کی آزمائشوں کو شہد کا گھونٹ بنا کر پیا لیکن جب آزادی حاصل ہوئی تو انھوں نے اپنی ساری قوت اور توجہ اس بات پر وقف کر دی کہ قومی زندگی صالح بنیادوں پر قائم ہو۔ جب کبھی کوئی ایسا نازک موقع یا مشکل مقام آیا جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شاید مصلحت کی کشش انصاف اور راستبازی پر غالب آجائے تو ان کی اصول پرستی، جرأت اور حق گوئی نے سدِ سکندری کا کام دیا اور مصلحت پرستی کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے حق شناسوں نے ان کو قوم کے ضمیر کا خطاب دیا تھا۔ یعنی اس میدان میں انھوں نے اس فرض کے بار کو اٹھایا تھا جو گاندھی جی تمام دم سے تھے۔ ناواقف لوگ ان کو عام جلسوں یا سرکاری تقریبوں اور دوروں میں دیکھتے تو خیال کرتے کہ شاید مولانا آزاد اب سیاست کے مرکز سے دور ہو گئے ہیں۔ لیکن انھیں معلوم نہیں کہ ہر مقام اور زمانے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ جب کانگرس آزادی کی جنگ کر رہی تھی مولانا اس کے ایک ممتاز رکن اور صدر کی حیثیت سے طوفان کے مرکز میں رہے۔ آزادی کے بعد انھوں نے اپنے مت ایک دوسری شاہراہِ عمل متعین کر لی تھی جس پر چل کر وہ ملک کی خدمت اور رہنمائی کر سکتے تھے۔ بے شک یہ وہ ایک لحاظ سے گوشہ نشین تھے، لوگوں سے کم ملتے جلتے تھے لیکن ان کی انگلیاں قوم کی نبض پر تھیں اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے اور کیا کرنا چاہئے۔ اس زمانے میں ان کی شان یہ تھی ؎

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!

اور سب کی رفاقت کا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے بنانے والے نے ان کو بلا لیا اور وہ اس کا نام لیتے لیتے اس کے حضور میں پہنچ گئے تو نہ صرف لاکھوں دلی والوں کی بلکہ کروڑوں ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت، صبر و ضبط کے بندھن توڑ کر امڈ پڑی اور باہمی فرقوں اور اختلافوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموش اور بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ میں نے اس جمِ غفیر میں جو ۲۲ فروری کو ان کے مکان کے گرد جمع تھا ایک بوڑھے سکھ کو یہ کہتے سنا "ارے تمہیں کیا معلوم ہے آزاد نے تو بادشاہت کی ہے بادشاہت!" ایک معنی میں یہ بالکل سچ ہے۔ وہ دل اور دماغ کے بادشاہ بھی تھے اور حکومت کی پالیسی کے بنانے اور

ڈسپلن میں ان کا بڑا حصہ تھا اور ان کے ساتھی ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے اس کے پیشِ نظر اس بوڑھے کا یہ قول بےشک صحیح معلوم ہوتا ہے

لیکن یہ بادشاہ جس میں ایک طرف انتہائی خودداری اور برتری کا احساس تھا جو کبھی کسی قوت کے سامنے سر نہ جھکاتا تھا، ایک فقیر بھی تھا فقیر اقبال کی اصطلاح میں یعنی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

اسی وجہ سے اس کے ہاں فقر و شاہی کے ڈانڈے مل جاتے تھے اور دل پکار اٹھتا تھا

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

اس فقیر کے پاس متاعِ دنیا میں سے بہت کم تھا، نہ مال، نہ دولت، نہ جائداد، نہ سرمایہ۔ نہ خانگی زندگی کی وہ پابندیاں جو دل میں کمزوری پیدا کرتی ہیں۔ اس میں بےنیازی کی ایک خاص شان تھی اور نام و نمود اور شہرت پسندی سے نفرت۔ کبھی کسی مدرسہ، کسی درسگاہ، کسی عمارت کو اپنے نام سے منسوب نہیں ہونے دیا۔ شاید ایک دو کے سوا کسی یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری قبول نہیں کی۔ تاریخ پیدائش تک پوشیدہ رکھی کہ دوست اور عقیدت مند اس کو منانے نہ لگیں۔

مولانا آزاد کے جہاں ایک شاہانہ شخصیت اور انداز فکر و عمل پایا تھا وہاں ان کے دل میں عام لوگوں، غریبوں اور محتاجوں کے ستائے ہوئے طبقوں کے لئے خاص ہمدردی اور لگاؤ تھا جس کے [illegible] تک ستائے گی۔ دیکھیے اس کی ایک ادنیٰ جھلک آپ کو اس انتساب میں دکھائی دے گی جو انھوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنے علمی اور مذہبی شاہکار "ترجمان القرآن" کے لئے لکھا تھا۔ اس بیش قیمت تصنیف کو انھوں نے کسی رئیس کے نام منسوب کیا نہ عالم کے نہ کسی دوست کے نہ عزیز کے بلکہ ایک غریب گمنام اجنبی کے نام جو ان کے پاس ایک دوسرے دیس سے سینکڑوں میل چل کر علم اور دینی ہدایت حاصل کرنے آیا تھا۔

"غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے، میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"
"ہاں جناب، میں بہت دور سے آیا ہوں۔"
"کہاں سے؟"
"سرحد پار سے۔"
"یہاں کب پہنچے؟"
"آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے انہوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرے پہنچا دیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔"
"افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟"
"اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔"

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کے لئے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں، مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔"

کیسا شاندار اور اثر آفریں اعتراف ہے طلب صادق کا، علم کی پیاس کا، مذہب کی سچی لگن کا خواہ وہ ایک بوسیدہ کمبل ہی میں ملبوس ہو۔

اس مردِ مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا، وجاہتِ ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی، دماغ کی توانائی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی، دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا سب کے لئے جگہ تھی، علم کی وہ فراوانی کہ حدود کا پتہ نہ چلے، تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی ہی میں افسانہ بن گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز بخشا اور لفظوں سے کام لیا شعلہ اور شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور تلوار کا۔ مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں

دین اور دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکر حافظہ ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے — یہ تھے مولانا آزاد — ایسا دوسرا کہاں سے آئے گا؟ بقول حالی

ملک یکسر ہوا ہے بے آئین — اک فلاطون تھا سو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ تقریر ہی — ڈھونڈتے کیا ہو سیبویہ ملّاں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش — بوئے گل وا ہے کیوں گلستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی — شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

آخر میں ایک قطعۂ تاریخ سن لیجئے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مولانا کی وفات پر لکھا ہے اور جس کے آخری شعر میں امید کا وہ پیام ہے جو دکھ اور مایوسی کی موجودہ کیفیت میں ہماری ہمت بندھاتا ہے

کل تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیش کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد

آہ بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغ ارم میں ہے آزاد!
رحلت کی تاریخ تری نکلی منہ سے فوراً یوں کہ
دل پر آہ ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد!

۱۹۵۸ء

اتنے میں محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہے
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھ اب بھی ہم میں ہے آزاد!
روح فکر و عمل اس کی سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں ہے آزاد، دیر و حرم میں ہے آزاد!

یہ تو تھی جگ بیتی، آپ بیتی کوئی کیونکر سنائے سوائے اس کے

گفتنی نیست کہ بر غالب ناشاد چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

سرفراز حسین رضوی خبیر لکھنوی

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

ہوا غروب وہ مہر کمالِ علم و ادب — قمر 'ہلال' کی صورت تھا جس کا حلقہ بگوش
بلند جس نے کیا تھا نشانِ آزادی — عمل میں گاندھی مرد کے تھا جو دوش بدوش
بنایا ملک کو آزاد تھا جو نام آزاد — جگا چکا جو ہمیں، سو گیا وہ صاحب ہوش
بساطِ علم و فراست پہ اہل بیت و کشاد — تھے اُس کے سامنے شاگردوں کے حلقہ بگوش
نہاں تھے لاکھ تکلم سکوت میں اس کے — بتائے مشک کی خوشبو نہ جیسے مشک فروش
وہ سو رہا ہے بظاہر فنا کے دامن میں — پر اس کا نام بقا سے رہے گا ہم آغوش
زبان موجۂ سیلاب تھی دم تقریر — کہ جس طرح ہو سمندر میں وقتِ طوفاں جوش
جہانِ علم و ادب میں جو چھایا سناٹا — تو آئی غیب کی جانب سے یہ ندائے سروش

خبیر مصرع تاریخ لکھو ہجری میں
اُداس اُداس ہے مجمع ابوالکلام خموش

۱۳۷۷ھ

ظفر حسین خاں

ابوالکلام بہ حیثیت انشا پرداز

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت اپنی جگہ ایک انجمن تھی۔ وہ ایک بڑے عالم بھی تھے اور انشا پرداز بھی، مفکر بھی تھے اور مدبر بھی۔ لیکن غور کیجئے تو اُن کی شخصیت کا مایۂ خمیر ادب ہی تھا اور وہی اُن کے مشاغل کے مختلف میدانوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ اُن کی سیاسی تقریریں، اعلیٰ ادب کی بہترین مثالیں ہیں۔ اُن کے فلسفیانہ افکار صاف اور ستھرے ادبی پیرایۂ بیان سے آراستہ ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل کو ایسا سریع الفہم بنا دیتے ہیں کہ معمولی سے آدمی کو بھی غلط فہمی کا امکان نہیں رہتا۔ اسے ادبی اعجاز نہیں تو کیا کہئے۔ مولانا سیاسیات میں بھی ادبی دروازہ سے داخل ہوئے۔ الہلال اور البلاغ بہترین سیاسی رسالوں سے پہلے بہترین ادب پارے تھے جنھوں نے ملک کے دل میں جگہ کرکے مولانا کو لیڈروں کی صفِ اوّل میں کھڑا کر دیا۔ زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں مولانا کی عظمت، اُن کی انشا پردازی کی رہینِ منت ہے اور یہی کہنا چاہئے اُن کا اصلی جوہر ہے۔

راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں شرفِ نیاز سب سے پہلی بار لکھنؤ میں حاصل ہوا۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور مولانا کی تحریروں کی وجہ سے زبانی آشنا تھی۔ اُن سے ملنے کا کمال اشتیاق تھا کہ سنا مولانا لکھنؤ آئے ہیں اور سول ملٹری ہوٹل میں قیام ہے۔ سول ملٹری ہوٹل، اس زمانہ میں شہر کا سب سے فیشن ایبل ہوٹل تھا جو مغربی انداز پر ایک یوروپین مہتمم کی نگرانی میں چلتا تھا۔ مولانا اور سول ملٹری ہوٹل، یہ ایک اجتماعِ نقیضین سا معلوم ہوتا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی میرے ہم مکتب تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے پہلے سے رسم و راہ رکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے انھیں کو اپنے تعارف کا واسطہ بنایا۔ ہم دونوں جب اُس کمرہ کے برآمدہ میں پہنچے جس میں مولانا مقیم تھے تو کمرہ کے اندر سے میں نے ایک گلیم پوش نوجوان کو برآمد ہوتے دیکھا۔ مولانا عبدالماجد نے میرا تعارف کرایا۔ میرے ذہن میں مولانا آزاد کا جو تصور تھا اس پر یہ دوسری ضرب تھی۔ یعنی یہ کہ وہ کم و بیش ہم لوگوں کے ہم عمر سے تھے اور ابھی ڈاڑھی وغیرہ ان کے چہرے پر برآمد ہی نہیں ہوئی تھی۔ مولانا ہم لوگوں کو اپنے کمرے میں لے گئے اور چائے کے ساتھ اپنی سحر تقریر سے جو ہم لوگوں کی ضیافت کی اُس کا ذائقہ حافظہ میں اب تک محفوظ ہے۔ واقعاتِ حاضرہ پر ہر حال کے اظہار کے لئے بہتر سے بہتر الفاظ و فقرات کا انتخاب، برجستہ مناسب حال اشعار کا استعمال، غرضیکہ وہ کالج کے دو نوجوانوں کے ساتھ معمولی بات چیت میں بھی ملکہ ادبیات عالیہ کا ایک کلاسیکل نمونہ تھا۔ اس قدر بے پناہ قوتِ بیان کا مظاہرہ دیکھنے کا اتفاق مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مشہور عالم اطالوی علمی کروچے نے اپنے "جمالیات" میں ماہرینِ فن کے کمال کا پیمانہ قوتِ اظہار ہی کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بڑے سے بڑے مدعیانِ فن کے حواس اس وقت درست ہو جاتے ہیں جب وہ اپنے "کمال" کے اظہار پر مجبور ہوتے ہیں، جیسا کہ کروچے کا کہنا ہے کہ کسی مدعی فن کے امتحان کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ اس سے کہئے کہ ذرا رنگ برنگ کے دو پیالی رنگ دیکھئے یا یہ پنسل حاضر ہے اس سے کوئی نقشہ کھینچ کر اپنے وارداتِ قلب کا ذرا اظہار تو فرما دیجئے۔ قوتِ اظہار کی اس جانچ سے دنیا کی دنیا میں اُن کے کمال کی پول کھل جائے گی۔ اور معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

قوت گویائی

مولانا کی قوت اظہار و بیان کے نمونے ان کی ہر تحریر میں قدم قدم پر بغیر کسی تجسس کے ملتے ہیں چنانچہ "تذکرہ" کے چند ورق الٹتے ہی مولانا کی یہ تحریر سامنے آجاتی ہے:

"وہی دنیا جس کے میکدۂ فراموشی سے غفلت کے جام لنڈھائے جاتے تھے، جس کے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، جس کے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی جاتی تھیں اب اس کا ایک ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ، ہشیاری و بینش کا مرقع تھا، عبرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کئے، خاک پامال نے اڑ اڑ کر افسانے کہے، آسمانوں کو بار بار اترنا پڑا تاکہ سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کئی ہی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ عصمت آسمانی کے تارے توڑ لائیں، فرشتوں نے مانند تعاقب کے کہیں فروش نہ ہو جائے، سورج چراغ سے کرا کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اتار دیئے، سارے پردے چلمن ہو گئے، سب کی رگوں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں دعوتیں بھری تھیں، سب کے ہاتھ کشش و قبولیت کے لئے دراز تھے، بادل کو پکڑا تو سارا ہستی کا جلوہ نکلا، گل کو پاس بلایا تو لب ہائے راز کا ایک تبسم آشنا راز نکلا، ہوا کے جھونکے سینہ میں آ گئے مگر پھر بھی خالی رہیں۔ سمندر نے اپنی ساری موجیں خرچ کردیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا ۔۔ غرضیکہ ہمت خوابیدہ جاگ اٹھی اور دل رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور نئے نئے سامانوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ عالم آفاق و انفس میں جو کچھ ہے اُن میں سے کوئی نہ تھا جس کے اندر پر گرہ یا آنکھوں میں غمزہ ہو سب کی زبانیں گویا، سب کے اشارے آشنا، سب کی سطوحیں ابھری ہوئی تھیں۔ کوئی لب بعد ہار، کوئی جلوہ مستور، نہ آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی، نہ کانوں نے سننے میں، چشم و گوش سے جو کچھ بہم پہنچایا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکے۔

سخن عشق بدل درد و لب را مکشا
سر این سفینہ زد و مذکر یا شمع فرو برد" (صفحہ ۳)

یا پھر کمال ایجاز کے ساتھ ایک اہم حقیقت کا اظہار ان چند لفظوں میں ملاحظہ کیجئے:

"غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجب حال ہے۔ تیس برس کی مدت ہو یا تیس دن کی۔ مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچئے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیوں کر کٹے گی؟ گزرنے کے بعد سوچئے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا وہ چند گھڑیوں سے زیادہ نہ تھا۔" (غبار خاطر صفحہ ۲۰)

زبان دانی

جرمنی کے مشہور عالم شاعر و ادیب گوئٹے کا قول ہے کہ اگر انسان دوسری زبان نہ جانتا ہو تو وہ اپنی مادری زبان کو بھی سلیقہ سے استعمال نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا کی اس حیرت انگیز قوت گویائی کا باعث اُن کی متعدد زبانوں سے واقفیت ہو۔ عربی اور فارسی ادب پر تو اُن کو عبور حاصل تھا ہی۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی خوب جانتے تھے اور آخر الذکر دونوں زبانوں کی کلاسکی کتابیں اکثر اُن کے زیر مطالعہ دیکھی گئی ہیں۔ پھر قدرت سے حافظہ ایسا زبردست پایا تھا کہ ایک بار جو پڑھ لیا پتھر کی لکیر ہو گئی۔ مولانا کو عربی، فارسی، اردو کے ہزاروں شعر ازبر تھے۔ غبار خاطر میں فرماتے ہیں۔

"معلوم نہیں ایک خاص طرح کی ذہنی واردات کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی۔ جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو۔ اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کے واردات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کسی اچانک اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں۔ مضمون کے ساتھ کتاب یاد آ جاتی ہے کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ کیفیت کہ مضمون ابتدائی سطروں

میں تھا، یہ درمیانی سطروں میں یا آخری سطروں میں، یہ مصرع کا رُخ
کرہ میں وقت کا تھا یا بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی جب
معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر
خود بخود زبان پر طاری تھا۔

کم بدم دیدیم اندروں شمار است
گوی تر پیشتر از داغ وجودم

ساتھ ہی یاد آگیا کہ شعر حکیم صدرائے تبریزی کا ہے جو اواخر عہد
اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے عہد تک زندہ رہا۔
آفتاب عالم تاب میں نظر سے گزرا تھا۔ غالباً بائیں طرف کے صفحہ
میں اور مصرع کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتاب عالم دیکھے ہوئے کم
سے کم تیس برس ہو گئے ہوں گے پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اُسے کھولا
ہو۔" (صفحہ ۹۰ تا صفحہ ۱۰۰)

اسالیب بیان

اسی طرح مشرقی اور مغربی فلسفہ کے مسائل اُن کے ذہن میں محفوظ تھے جن پر مخصوص محفلوں میں پُر لطف تکلم کرتے تھے۔ ادب لطیف ہو یا فلسفہ، سیاسی بحث ہو یا مذہبی مسئلہ اور پھر تحریر ہو یا تقریر ہر جگہ اُن کی "ابوالکلامی" کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موضوع بحث کی نوعیت کے اعتبار سے مولانا کا اسلوب بیان بھی بدلتا ہے۔ فلسفیانہ مسائل کی گرہ کشائیوں میں ان کا اسلوب عموماً صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ ایسی تحریروں میں شاذ و نادر شعر استعمال کرتے ہیں لیکن جیسا اوپر اشارہ کیا گیا اُن کی ذہنی [illegible] میں ادبی صورت ہمیشہ مضمر پائی جاتی ہے جو ذرا سے غور کرنے سے ظہور کے سامنے آجاتی ہے۔ خالص ادبی تحریرات میں جو استعارہ و تشبیہ تھا وہ علمی تحریروں میں تمثیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مولانا کی منطق اکثر و بیشتر تمثیلی ہوتی ہے استقرائی یا قیاسی نہیں۔ وہ اپنے تمثیلی استدلال سے مشکل مباحث اس طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ بادی و شاہد، استقرا اور قیاس کی کاوشیں ان کی تمثیل کے سامنے پانی بھرنے لگتی ہیں۔ ایک اچھوتی تمثیل کی مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا یہی حال رہا جو ماہ و یوم چشم ظلمات [illegible]
وسعت کے آج نظر آرہا ہے تو کچھ عجب نہیں کہ مسلمان مسجد کا دروازہ
کھولنے، اذان دینے، نماز پڑھنے اور رمضان کا روزہ رکھنے
کے لئے بھی گورنمنٹ کی اجازت اور رضامندی کے منتظر رہا کریں گے اور
جمعہ کے دن خطیب منبر کے سامنے ہمہ تن استفادہ ہو کر کھڑا رہے گا
کہ تمغہ سے نادر آجائے تو خطبہ پڑھنے کے لئے آمادہ ہو"

(الہلال ۹ دسمبر ۱۹۱۲ء)

مولانا کی انشاپردازی کے اجزائے ترکیبی۔ استعارہ، تشبیہ، تضاد

مولانا کے کمال انشاپردازی کا اصلی میدان ادب لطیف ہے۔ جس کے جوہر تازہ استعاروں، اچھوتی تشبیہوں کے ساتھ چبھتے ہوئے تضادات بھی ہیں جو ان کی نوشتہ جات میں بکھرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ایک تضاد کی مثال ملاحظہ فرمائیے۔ استعارات و تشبیہات تو انھیں اقتباسات میں آپ نے دیکھے۔

" ہمارے تعلیم یافتہ دوستوں کا کچھ عجب حال ہے۔ ان
کے پاؤں کو دیکھئے تو [illegible] تقلید و عبودیت فکر
کی زنجیریں پڑی نظر آتی ہیں مگر چہرے کی طرف نظر اٹھائیے تو زبان
کو ادعائے اجتہاد سے فرصت نہیں۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں کچھ
تضاد کا اڈہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے کھڑا ہو
اور عین اس وقت جب کہ اس کے پاؤں میں تقلید و استعباد
کی زنجیریں رباب کی طرح صدا دے رہی ہوں۔ اجتہاد فکر اور
حریت رائے پر لکچر دینا شروع کر دے۔" (الہلال ۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء)

ٹھیٹ ہندی کے الفاظ

بہت فارسی ترکیبوں کے ساتھ مولانا اکثر ٹھیٹ ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ایک خاص لطف دیتے ہیں مثلاً

"جو اس کی گرفتاری بھی گرفتاری اور اس کا انکار بھی انکار
ہے۔"

"جس کو کسی کسی تمناؤں اور چاہتوں سے ہمیشہ سینے میں
بسائے رکھا تھا کہ کہیں ناسور بننے کی جگہ مندمل ہو جائے۔"

"افسوس توفیق الٰہی کی سیکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و
تربیت غیبی کے ہزاروں ڈھب ہیں۔"

"دل کی ٹیس اور ٹپک" وغیرہ وغیرہ۔

ماخذ و موثرات

مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے ادب لطیف کو اگر نثر منثور کہا جائے تو

سبب جاذب ہوگا۔ شاعری کا کونسا کمال ہے جو ان کی نثر میں جلوہ افروز نہ ہو۔ کون سی صنعت ہے جو ان کی تحریر میں نہ ہو۔ بس وزن اور قافیہ ردیف سے عاری ہے اس لئے آپ اسے نثر کہنے پر مجبور ہیں۔ ایسی نثر جس پر سیکڑوں نظمیں نثار ہیں۔ مولانا کی انشاپردازی اگرچہ اپنے مخصوص رنگ میں یکتا ہے لیکن غور کرنے سے اس میں کچھ اثرات ملتے ہیں جو محمد حسین آزاد، ظہوری، عرفی، غالب امثی کی سحر آفرینیوں اور ادا ساز تراش خراش کے مرہون منت معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ مسلم ہے کہ مولانا آزاد ہر تقلید سے آزاد تھے۔ اور جابجا انھوں نے اپنی آزاد روی کا اپنی تحریرات میں اظہار بھی کیا ہے۔

ظرافت

مولانا کی ظرافت اور عام ظرافت میں وہی فرق ہے جو کسی دہقانی کے بے تکا قہقہہ مارنے اور کسی متمدن و مہذب کے مسکرانے میں ہوتا ہے۔ مولانا کی ظرافت مہذب، سنجیدہ اور شان دار ہوتی ہے جو عالموں کے لئے مخصوص ہے جس میں کوئی سوقیانہ یا بازاری پہلو نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت ذیل کی مثالوں سے آشکار ہوگی۔ یہ دونوں اقتباس مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں جو جلسے لکھنؤ میں ہوئے تھے ان کے متعلق ہیں۔ راقم الحروف ان جلسوں میں موجود تھا۔

"ابھی میں جرآئی کر (مرآتیں) کے بال ڈر رہے ہم نے کہا کہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ وہی طاقت کے ہراول ابھی حریت ایک طرف اور ان نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے۔ جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر این است و ابرو این و ناز و عشوہ این
الفراق اے ہوش و تقویٰ الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبائے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذائے جزو سے معدہ خالی ہو جاتا ہے۔ جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ اور سریع ہضم ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی بے قدری نہیں کیا تعمیل ہوگی کہ صبح تک معدہ میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدہ سے۔"

(الہلال، ہفتہ ہمیشی کا صبح شمارہ ۵ فروری ١٩١٣ء)

"جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ انھیں اس کی کیفیت سمجھائی جا سکے۔ چہرے جوش و ہیجان سے سُرخ، گردن کی رگیں ابھری ہوئی، گلے شدت شور و ہنگامہ سے بڑھے ہوئے، ہاتھوں میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں، اور پاؤں کو اضطراب رقص سے قرار نہیں، منہ سے کف اڑ رہی تھی اور چوں کہ قریب قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پونچھتے اور پھر کف اڑاتے۔ منتظمین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کے اسٹیج سے میدان رقص کا کام لیا جائے گا ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوش تواجد میں گردش رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ اس لئے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیں تختوں کو کوٹ رہا تھا۔ یہ رقص معلوم کا اصلی ایکٹ تھا اگر (سرمری اور رنگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقین ہے کہ ان پُر جوش نوجوانوں کی ایک کھیپ تو فوراً اپنے ساتھ لے جاتا۔"

(الہلال - ١٢ مارچ ١٩١٣ء "ہفتہ ہمیشی کا صبح شمارہ")

چند تذکرات

مولانا کے نقش قدم پر چلنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ الہلال صرف اُن کی سیاسیات ہی کا آرگن نہ تھا۔ بلکہ کالج کے نوجوانوں کے اندر ادبی ذوق و بیداری پیدا کرنے کا بھی ایک مؤثر آلہ تھا۔ راقم الحروف کو بھی اردو پڑھنے لکھنے کا شوق الہلال کے مطالعہ ہی سے پیدا ہوا اور پھر الہلال ہی میں 'ابوالاثر مراد' کے نام سے مضامین لکھنا شروع کئے جو مولانا کی اصلاح و تصحیح کے بعد الہلال میں شائع ہوتے رہے۔

ایک بات کا ملال مجھے تمام عمر رہے گا۔ الہلال جب اپنے اقتصاد کے شباب پر تھا، مولانا نے مجھے اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ مگر اپنی ناتجربہ کاری سے میں نے تکمیل تعلیم کو ترجیح دی اور دنگیا حق یہ ہے کہ مولانا کی صحبت ایک ایسی جنس تھی جو ہر قیمت پر خریدنا چاہئے تھی۔ اُسی زمانہ میں مولانا نے مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی بلایا تھا۔ سید صاحب الہلال کے ادارہ میں عرصہ تک رہے اور مضمون نگاری کی خوب

دی۔ الہلال کے بہت سے مضمون ایسے ہیں کہ لوگ اب تک مولانا کے زیرِ قلم سمجھتے ہیں مگر دراصل وہ نقوشِ سلیمانی ہیں۔ مثلاً کانپور کی مسجد کے مسئلہ پر زبردست مضامین کا سلسلہ سید صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مولانا کے قلم کا اثر نہیں۔ مولانا کا اسلوبِ تحریر بلاشبہ ناقابلِ تقلید ہے لیکن الہلال کی بعض تحریریں جیّد سے جیّد ناقد کے سامنے رکھ دی جائیں اور پوچھا جائے کہ کون سی تحریر مولانا کی اور کون سی سید صاحب کی ہے تو بتانا مشکل ہوگا۔ مولانا کے مضامین اور مقالات جمع اور شائع کرنے والی کمیٹی میں ایسا شخص ہونا چاہئے جو سید صاحب کے مضمونوں کو مولانا کے مضمونوں سے الگ کر سکے۔

چالیس برس سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد جب مولانا شبلی یادگار لیکچر کی ممبری کے لئے رام پور سے گزرتے ہوئے تو میرا قیام رام پور ہی تھا۔ الہلال سے علمی ربط ایسا تھا کہ یاد رکھنے کے قابل ہو۔ لیکن مولانا کو سب یاد تھا۔ نہایت گرم جوشی سے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی اور واپس تشریف لے جانے کے دو ڈیڑھ مہینے کے بعد پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کا خط آیا۔ عرض نہیں کر سکتا کہ صحبت کے چند دن کس لطف سے کٹے۔ اور الہلال کے دفتر میں شامل ہونے کی حماقت پر میں نے اپنے تئیں کتنی لعنتیں کی۔ مولانا شاکی تھے کہ دہلی میں کوئی ایسا ہمدم و ہمراز نہیں کہ جس کے ساتھ گھڑی دو گھڑی بات کی جا سکے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اپنی افتادِ طبیعت کے اعتبار سے وہ سیاسی ہنگاموں کی تیز لپٹوں اور شہرت پسندی سے دور تھے۔ وہ پڑھنے لکھنے اور غور و فکر کے لئے گوشۂ تنہائی کے طالب تھے۔ لیکن ان شورشوں نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا اور اُن کی ساری زندگی انہیں ہنگاموں میں کٹی۔ مگر جیسا عرض کیا گیا اُن کی ہنگامہ انگیز سیاسی تقریریں بھی اعلیٰ ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ مولانا ہر رنگ میں ادیب ہی رہے۔

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

مولانا کی شخصیت کی سیمابی عمر کی میعاد کیفیت رہی۔ تخیل ہی نے اُن کے ادب میں ایک بے مثال رمزیت Symbolism پیدا کر دی ہے۔ تخیل ہی اُن کے تروتازہ استعاروں کا سرچشمہ ہے اور تخیل ہی اُن کے فلسفیانہ مباحث میں منطقی استدلال کے حسن میں ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں اُن کی جولانگاہ ادبیاتِ عالیہ ہی کا میدان ہے۔ دیگر میدانوں میں اُن کا ورود "[illegible]" کا مصداق ہے۔

تصنیفات

مولانا کے مضامین سے رسالہ الندوہ، الہلال اور البلاغ مالا مال ہیں اور اُن کے جمع کرنے اور سلیقے سے کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی بڑی تصنیفات مثلاً ترجمان القرآن، تذکرہ، غبارِ خاطر وغیرہ کے علاوہ اُن کے بعض مقالے مثلاً "خونِ شہادت کے دو قطرے" [illegible] مستقل طور پر طبع ہونے کے مستحق ہیں۔

موعظت و ذکریٰ

"۔ اگر پانی کہے کہ یہ میری کارفرمائی ہے تو آفتاب بھی چمک سکتا ہے کہ یہ اس کی حرارت کا معجزہ ہے۔ اگر دہقان مدعی ہو کہ اس نے بیج ڈالا تو موسم اُسے جھٹلا سکتا ہے کہ بغیر میرے آئے ہوئے محض تمہاری بیج ریزی کیا کر سکتی تھی؟ مزدوروں نے ہل جوتا، کاشتکار نے بیج ڈالا، محافظوں نے رکھوالی کی اور موسم نے آبپاشی۔ ان میں سے ہر ایک دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں ہی اس لہلہاتے ہوئے کھیت کی وجود پذیری کی علت ہوں مگر وہ جو ان سب سے بالاتر قوت ہے کہتی ہے کہ تم سب ہیچ ہو۔ اگر قدرت اپنی تمام اسباب و وسائل مہیا نہ کرتی تو نہ تو ایک بیج بارآور ہوتا اور نہ ایک سبزہ زمین پر نظر آتا۔"

(الہلال ۳ فروری ۱۹۱۳ء)

بسمل سعیدی

مولانا ابوالکلام آزاد

کم ہوا کرتے ہیں اس دنیا میں وہ مردانِ کار
زندگی اور موت دونوں کو ہو جن سے افتخار

زندگی اپنے محاسن خود بیاں کرتی نہیں
موت کرتی ہے محاسن زندگی کے آشکار

زندگی رکھتی ہے آغوشِ بقا میں کچھ نفس
موت کرتی ہے حیاتِ جاوداں سے ہمکنار

جب سماتی ہے یہ بڑھ کر وسعتوں میں موت کی
آب جوئے زندگی بنتی ہے بحرِ بے کنار

ثبت ہو جاتا ہے لوحِ دہر پر اس کا دوام
موت کر دیتی ہے جس کی زندگی کو استوار

زندگی جس سمت جب چاہے بدل سکتی ہے رخ
موت ہی پر منحصر ہے زندگی کا اعتبار

اپنے زشت و خوب میں ہوتی ہے ساری زندگی
موت کے اک لمحۂ آخر کے زیرِ اختیار

زندگی ہے موت کے تابع مگر با ایں ہمہ
موت کا بھی ایک وضعِ زندگی پر ہے مدار

زندگی بھر کے بیانوں ہی کا ہے اک خواب موت
موت خود بھی زندگی کی ہوتی ہے آئینہ دار

بالعموم انساں کو موت آتی ہے حسبِ زندگی
ہے یہی کچھ فطرتِ عادل کا دستور و شعار

الفراق اے مولوی! بندۂ مرگ و حیات
موت کے راس بضاعت، زندگی کے شاہکار

تیری مرگ و زیست دو صفحے ہیں اک زیبر کے
سلسلہ کردار کا تیرے ہے حسنِ کوہسار

تھا اسی کا منتہیٰ تیرا عمل آغاز سے
زندگی جس موت پر منتج ہوئی پایانِ کار

ماتم اس نیت کرنے کو تیری موت پر
آج شاید آسماں پر ہوں ملائک سوگوار

سلسلہ جن کی فضیلت کا ہے تا خیر القروں
حیف اُن اسلاف کا تھا آخری تو یادگار

موج اندر موج تھا اک قلزمِ زخّارِ علم
علم کا تو ایک عالم تھا دیار اندر دیار

ماکذب تھا رد ترا اور ماصدق تیرا قبول
نہی و امرِ دینِ برحق تیرا ترک و اختیار

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
تو مشیرِ عقل تھا اور تو جنوں کا مستشار

تیرے ہی نقشِ قدم پر پڑتے ہیں سب کے قدم
کس قدر روندی ہے تو نے عظمتوں کی رہگزار

دیکھ کر انداز تیری روح کے روزِ ازل
دی حیاتِ دُنیوی تجھ کو ابد نے مستعار

پھر بنائے پختگئ فکر تیری زندگی
اپنی ایک اک سانس میں رکھتی ہے قرنوں کا شمار

ہو سکا تجھ تک پہنچ کر معتبر مدرِ جہاں
ہو سکے گا اور کیا نورِ عظیمِ روزگار

تھا ترے آغازِ عظمت ہی کا یہ "جم الہلال"
تھی تری صبحِ نخستیں زودکشِ نصف النہار

کس قدر ویراں ہے مستقبل انسانیت
عالمِ تخلیق میں ہے اک خلائے بے کنار

ہو سکے گی کیا تلافی اب غمِ مافات کی
حشر تک شاید رہے گی چشمِ ہستی اشکبار

تھی تری وضعِ تواضع میں سرافرازی کی شان
تیری افتادِ طبیعت میں پہاڑ کا وقار

پیش پا افتادہ رہتی تھی بہ صد عجز و نیاز
کج کلاہی سے تری، شانِ کلاہِ تاجدار

ناطقہ تیری طلاقت پر اگر قرباں تھا
تھی طلاقت تیرے اندازِ خطابت پر نثار

اس طرح منہ سے ترے جھڑتے تھے پھول الفاظ کے
غل ہے جیسے پہاڑوں کا گرے اک آبشار

جنتِ ادنیٰ تھی تیرے کلک کی اعلیٰ ادب
غازۂ روئے نگارستن تیری خاطر کا غبار

نامۂ اعمال در دست آئیں گے جس وقت لوگ
حشر میں تو آئے گا تفسیرِ قرآں در کنار

ناموافق جس قدر ہوتی سیاست کی فضا
ہمتِ عالی کو ہوتی اتنی ہی کچھ سازگار

قلعۂ احمد نگر کو یاد ہیں وہ صبح و شام
تھی جہاں شامِ خزاں تیرے لئے صبحِ بہار

تھا ترے نزدیک عین وقتِ آزادئ ہند
عہدِ افرنگی کا دورِ قید و بند و گیر و دار

ہاں پریشاں کن تری جمعیتِ خاطر کو تھا
مسلم ہندوستاں کا افتراق و انتشار

تو امیرِ کارواں بھی تھا امام الہند بھی
ماسوائے ملک، ملت کا بھی تھا تو ذمہ دار

منتہائے عزم تیرا اس سے ظاہر ہے کہ تھی
ہمرہوں کی منزلِ مقصود تیری رہگزار

تھا جبا نتاب فضیلت تیرا خورشیدِ حیات
اب حیات افروزِ عظمت ہے تری شمعِ مزار

سر بر افلاک اس زمیں کو کر گئی کشش کی نظر
زیرِ پائے مسجدِ جامع بنا کر یہ مزار

مسجدِ جامع! تری رفعت کا ضامن ہو گیا
علم و دیں کا اک ستوں، عزم و عمل کا اک منار

سربسجدہ ہے وہ تیری سیڑھیوں کے سامنے
تیری محرابوں میں بھی ایسے نہیں طاعت گزار

اُس کے ذمے تھے جو تیرے حق وہ پورے کر گیا
اب ترے ذمے ہے اُس پر رحمتِ پروردگار

تہنیت ہے عظمت یہ تیری منبر و ثیق دوام
یہ عظیم المرتبت تربت، فلک رفعت مزار

لہ یعنی جام الہلال پرچہ

محمد مجیب

انگریزی سے ترجمہ
مترجم۔ محمد شفیق الرحمٰن

تذکرہ

اس اوراقِ پریشاں کی تالیف کا باعث ایک دوست عزیز کا اصرار تھا، مولانا نے تذکرہ کے آغاز میں تحریر فرمایا ہے "اب وہ مصر ہیں کہ اپنے حالات بھی قلمبند کروں۔ اس ہیچمدان سرائی کے اہتمام سے اُن کا اصل مقصد یہی تھا۔" تذکرہ اسلامی فکر کے موضوع پر ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اُس کی حیثیت ایک کتاب سے بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک انسان ہے، ایک شخصیت ہے، ایک تصور اور روح ہے، ایک الہامی واعظ کی قوت عمل، ایک بڑے دل کا گریہ و بکا، ایک ادیب کا فن و ہنر، اور ایک فتح کا مسرت انگیز نعرہ، وہ ایسی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ایک تصور کا پیکر بن گئی ہے اور ایسا تصور جو فطرت انسانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

لیکن تذکرہ ایک اور کتاب ہے وہ کتاب نہیں جس کی خواہش ناشر کو تھی۔ اُن کا مقدمہ بہت دلچسپ اور قابل توجہ ہے۔ وہ صریحاً ایسے شخصیت پرست معلوم ہوتے ہیں جو تمام مشاہیر کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُن کی مولانا آزاد سے ۱۹۰۵ء میں واقفیت ہوئی۔ اُس وقت مولانا طالب علم ہی تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے ارتقا کو دیکھا۔ جب مولانا آزاد نے "الہلال" شائع کرنا شروع کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے قلوب کو ایک خاص اثر سے متاثر کر دیا تو مرزا فضل الدین کو خیال ہوا کہ اس کا عین وقت ہے کہ ایسی پراثر شخصیت کے بارے میں لوگوں کو اُن کے حالات سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ لیکن مولانا آزاد نے اُن کی خود نوشت سوانح عمری کی فرمائش کا مذاق اڑا کر ٹال دیا۔

"کتنی بڑی بڑی اور عظیم الشان زندگیاں ہمارے سامنے ہیں جن کے سوانح اور حالات نہیں لکھے گئے۔ اُن کو نظرانداز کر کے میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک مضحکہ انگیز حرکت ہوگی۔" لیکن یہ بات قابل شکر ہے کہ مرزا فضل الدین مزاج کے معاملہ میں نکتہ رس نہ تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد پر مسلسل تقاضہ جاری رکھا۔ یہاں تک اُن کو یہ وعدہ حاصل ہو گیا کہ "ہر ہفتہ کچھ لکھا رہے گا۔" جو کچھ اُن کو ہر ہفتہ ملتا رہا اُس سے ابتداء میں مرزا فضل الدین نے یہ سمجھا کہ مولانا آزاد اپنی خود نوشت سوانح عمری کو اپنے خاندان کے حالات سے شروع کرنا چاہتے ہیں لیکن جب مولانا آزاد موضوع سے بھٹکنے لگے اور یہ معلوم ہونے لگا کہ وہ اصل مضمون پر آنا نہیں چاہتے تو مرزا فضل الدین اس پر مجبور ہوئے کہ اُن کو روکیں اور درخواست کریں کہ مختصر لکھیں اور مطلوبہ موضوع پر رکھیں۔ لیکن مولانا آزاد کسی ہدایت کے پابند ہونے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اصرار کے جواب میں لکھا "میری طبیعت میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے بھیج دیتا ہوں، جمع کرتے جاؤ ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔"

لیکن مرزا فضل الدین بھی مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ وہ رانچی پہنچ گئے اور مقیم ہو گئے۔ مولانا آزاد رانچی میں نظربند تھے۔ مرزا فضل الدین پندرہ سوال ایسے مقرر کر کے لے گئے کہ جن کے اندر مولانا آزاد کی زندگی کی تمام تفصیلات آ جاتیں۔ انھوں نے مولانا آزاد سے ان سوالات کے بالترتیب جوابات کا اصرار کیا لیکن مولانا آزاد نے اپنی شخصیت کو شاعرانہ اشارات کے مزین پردے کے اندر چھپا لیا اور اپنے وجود کو گویا ایک روحانی جسم بنا لیا اور اُن کی مادی زندگی ایسی ہو گئی کہ موضوع کلام سے خارج ہو گئی۔ مرزا فضل الدین

عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی مجاز ہے۔ نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس
اعتبار سے تو اول و آخر جو کچھ ہے عشق ہی ہے۔ نظام کائناتِ ہستی میں محرک اس
کے سوا اور کون ہے؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور تسلیم
ہے تو اسی کے دم سے، دنیا میں جس قدر ظاہر ہے یہی ہے، جس قدر باطن
ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری نگاہ وحدت ناآشنا
نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کتنے ہی
پردے ہیں جو اسی کی نظری و کثرت میں نے جمالِ حقیقت یگانہ و یک رنگ
پر ڈال رکھے ہیں ورنہ

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

لاشبہہ یہ بھی لغزش تھی لیکن اس لغزش کو کیا کہئے جو محبوب کے قدموں پر
گرا دیتے۔ مقصود تو ساری راہوں سے اس تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی
ہی رہنما بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں، لاکھوں
ہوشیاریاں اس پر سے نچھاور ہوں، گر طمع خواہد زمن سلطانِ دیں، خاک بر
فرقِ قناعت بعد ازیں۔ اصل یہ ہے کہ اس راہ کا سارا دار و مدار قطع و وصل
اور شکستگی و پیوستگی پر ہے اور وہ ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بُعد
ہی میں سے ہو کر نکلی ہے۔ یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک
سے جڑنے کے لئے سب سے کٹنا، اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے
کہ وہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں جو پہلے کھول دیئے تھے۔

در قبولِ نظرِ عشق ہزاراں ترس است اوّل ار غایتِ رفتہ ندامت باشد

"تو اب اصل کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ماسوائی
اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لئے دو ہی صورتیں ہیں، یا تو کوئی ایسا
طاقت ور ہاتھ آمادۂ عقدہ کشائی ہو کر گن گن کر ایک ایک گرہ کھول دے۔
ایک کے بعد ایک، ساری زنجیریں کٹتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے جس کا
ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے
ٹکڑے کر کے رکھ دے، نہ ناخن گرہ کشا کی منت پذیری نہ زنجیروں کی حلقہ شماری
کا انتظار۔ ایک سوکھی لکڑی کو جلانے کے لئے ہزاروں تدبیریں کیجئے جب کہیں
آگ سے دھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آستانوں اور خرمنوں کے لئے
بجلی کی ایک ہی لپکِ شعلہ بار کافی ہوتی ہے۔

گفتم چہ گونہ می گذشتی در رہ مے کشی از یک نگاہ گشت، جوابے نگفتہ داد

"ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے، کوئی درمیانی منزل ہو اگر قدم آگے
بڑھنے سے رُک گئے تو وہی منزل بُت ہے اور وہی اُس کا پرستار، تسبیح آلائی
و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو
"بہر حال الحمدللہ کہ اس منزل کے وقفہ نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔
ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچے کے بھی تمام پیچ و راہ ایک ایک کر کے
دیکھ ڈالے، کوئی گوشہ کوئی مقام نہ چھوٹا ..
"اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں لیکن ہر رہرو کو دو مسلکوں
میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یا قمری و بلبل کی آوارگی و
شورش یا شمع کی خاموشی اور سوزش ...
"اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر
ہی اندر سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے

عریانیِ تنی ہوس ست، دے ریشہ گرفت داماں چاک و گریباں دریدہ را

......

اگر کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں آوارگی کی ہوتی ہو۔ یہاں ایک ایک گھڑی کا ایک
ایک لمحہ ایسا گذر چکا ہے کہ سینکڑوں آہیں اندر ہی اندر پی گئی ہیں، ہزاروں شورشیں
سینہ کے اندر جلی ہیں، آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی تو دل کے گوشہ
ہی میں طوفان اٹھاتے رہے۔ .
"اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا۔ لیکن فی الحقیقت
فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی ناکامی میں پوشیدہ تھی ...
"وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے
اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو مستی و سرشاری کی پیہم
دعوتیں دی تھیں۔ اب اس کا گوشہ گوشہ، چپہ چپہ، ہوشیاری و بینش کا مرقع تھا
بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرّے ذرّے کو گرم گفتار پایا، پتہ پتہ کو مکتبِ
مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے
کئے، خاکِ پامال نے اُڑ اُڑ کر گرم افشانیاں کیں، آسمانوں کو بار بار اترنا پڑا تاکہ
سوالوں کا جواب دیں، زمین کو کتنی مرتبہ اچھلنا پڑا تاکہ فضائے آسمانی کے تارے
توڑ لائیں، فرشتوں نے بار بار تقاضا کیا کہ کہیں محرم نہ ہو جائے۔ سورج چراغ

۔۔ نہ پائے کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب سے نقاب اُتار دیجئے، سارے پردے جھلی ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکایتیں بھری تھیں۔ ۔ ۔ ۔

"حالات ابتداء سے جیسے اور جتنے رہے، سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے جس تک بالآخر رسائی میسر آئی، قطع نظر اس معاملۂ خاص کے عقائد، اعمال، عادات، خصائل، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پایا ہو۔ پس ایسی شستگی و شگفتگی نہ تو کسی باہر کی ممنون ہے، نہ کسی زمان کی، نہ کسی خاندان کی، نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی، جو کچھ پایا ہے صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے جس نے بنایاں طلب صرف اُسی مرشد نیستی و ہادی طریق سے طلب۔

علم کا دروازہ اُسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اُسی نے بتلائی، معرفت کے صحیفے اُس کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اُس کے دستِ کرم میں تھے، شریعت کے حقائق کا وہی معلم تھا، طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا، قرآن کے بھید اُسی نے بتلائے، سنت کے اسرار اُسی نے کھولے، نظر اُسی نے دی، دل اُسی نے بخشا، کون سی مشکل تھی جو اُس سے حل نہ ہوئی، کون سا اُلجھاؤ تھا جو اُس کی سلجھی ہوئی نظر سے نہ سلجھ گیا؟ کون سی بیماری تھی جس کی دوا اُس کے دار الشفا سے نہ مل سکی؟

"ہاں، یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اُس رندی اور ہوسناکی کی تر دامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کی عین اکیس بائیس برس کی عمر میں دیکھ جبکہ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوٹا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑ آگیا ہے تو یہ اُس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے، کتنی ہی جھاڑیوں میں دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں، دونوں عالم کی امنگوں، اُمیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں سے جلانے پڑے تب کہیں جا کر اس کوچہ میں دم لے سکے جہاں آج اپنے آپ کو پا رہے ہیں۔ ۔ ۔"

یہ مسلمانوں کے مذہبی فکر کا ایک کارِ نمایاں ہے کہ پابندیٔ مذہب اور تصوف میں مطابقت کر دی۔ اور مذہبی غلو جو شرعی پابندیوں کے اظہار میں بطور زیادہ داخل ہو گیا تھا۔ اس کی اصلاح جوشِ ایمانی کی قدر و منزلت بڑھا کر کر دی، خدا کی نگاہ میں منفعل گنہگار کو، اُس محتاط متبع شریعت سے، جس کی طاعت رسمی و رواجی ہو لیکن دل سرد ہو، اکثر زیادہ بلند مرتبہ مرحمت ہوا ہے۔ لیکن تذکرہ محض آزادی کی حمایت نہیں تھا۔ اس کے برخلاف، مولانا آزاد پابندیٔ مذہب کی اُن لوگوں کی پابندیٔ مذہب کی جنھوں نے حق اور کلمۃ الحق کی زمانہ ساز فقیہوں اور غیر محتاط صوفیوں اور بے دین حکمرانوں کے مقابلہ میں حمایت کی، اپنے مخصوص زورِ بیان سے تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کسی طریقۂ خیال کے پیرو نہیں ہیں۔ وہ قرآن کی یا شریعت کی کوئی خاص تفسیر پیش نہیں کرتے۔ ان کا خاص تعلق رحمت سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا خاص تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ صحیح پابندیٔ مذہب، رحمت سے راسخ العقیدگی ہے۔

تذکرہ مولانا آزاد کے خاندان کے مختصر حال سے شروع ہوتا ہے۔ "میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہو گئے ہیں۔ اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے مشاہیر علم و فضل اور اصحابِ ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دنیوی عزت و جاہ کی اگرچہ اُن میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دُنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ اُن کے سامنے پیش کیا اور کبھی انھوں نے قبول کیا، کبھی رد کر دیا۔"

مولانا آزاد یہ تذکرہ، یہ ظاہر کرنے کے لئے کرتے ہیں کہ اُن کا یہ خیال نہیں ہے کہ کسی خاندان سے متعلق ہونا کوئی اعزاز اور مباہات کی بات ہے۔ اُس کے بعد وہ شیخ جمال الدین (د ۱۰۰۱) کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اُن کے مادری اجداد میں سے تھے۔ اُس کے بعد وہ اُس زمانہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ جمال الدین تھے وہ اکبر کا عہد تھا۔ اکبر نے مرتبۂ خلافت و امامت کا ادعا کیا تھا۔ یہ زمانہ اختلاف ہی کا تھا۔ بلکہ اُس وقت شدید مذہبی فساد برپا تھا۔ صوفی جو وحدت وجود کا عقیدہ رکھتے تھے، بھگت، جو لاادریت کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ صاحبانِ مذہب، جو ہر چیز میں، ہر جگہ ذہنی غذا کے جویا تھے۔ سیاست پیشہ جو حکومت کی ضرورت سے اتحاد کے لئے کوشاں تھے، عورتیں، جو خاندانی زندگی میں تقریبات اور مراسم کے اضافہ سے تنوع پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ ان سب نے ایسی صورتِ حالات پیدا کر دی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ گویا انسان اخلاقی احکام کی پابندی کے بغیر رہ سکتا ہے

لیکن اِن صورت حالات میں بھی جو لوگ ایقان کا آلۂ کار تھے اور مذہبی وجوہ سے اُن علماء کے مقابلہ میں جو اُس زمانہ کے حالات کو قائم رکھنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا۔ مولانا آزاد جس خاص شائقہ کا تذکرہ میں ذکر کرتے ہیں اُس میں محمد کے بانی زمانہ سار علماء ہی تھے اور حامیٔ حق سید محمد جونپوری تھے۔ سید محمد کے اوپر الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا ایک عقیدہ ہے کہ آخر زمانہ میں قیامت سے پہلے امام مہدی ظاہر ہوں گے۔ مخالفت کرنے والے علماء نے سید محمد کی تعلیمات کی مخالفت اور اُن کی اخلاقی اور مذہبی حیثیت کو دبانے میں اپنی تمام طاقت اور اثر صرف کر دیا۔ ظاہری مخالفت سید محمد کے مہدیت کے دعوی کی تھی۔ مولانا آزاد نہایت اہمیت سے بیان کرتے ہیں کہ اصل مقصد مخالفت سید محمد کے تجدیدی رجحان، دعوت کلمۃ الحق اور اسوۂ حسنہ حضرت رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی دعوت کو دبانا تھا۔

سید محمد کے اوپر الزام لگایا گیا کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو صریحاً کفر ہیں۔ اور اس سے مولانا آزاد کو یہ گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مستقل کیفیت وجدان پر فائز کیا ہے وہ کس حد تک اپنے بیانات کے ذمہ دار ہیں اور جس آزادیٔ بیان کے وہ مستحق ہیں وہ اُن کو ملنی چاہیئے۔ یہاں مولانا آزاد کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ والے لوگ اُس نص سے پہچانے جاتے ہیں جو اُن پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اُس زمانہ کے مومنوں پر واجب ہے کہ اُن کے بیانات کو فقہی تنقیحات کا موضوع نہ بنائیں۔ بلکہ اُن کے بیانات میں جو کچھ حق ہو اُس کو اخذ کریں۔

مولانا آزاد کے نزدیک پابندیٔ مذہب پر مغز و مباحات اور اعمال سے غفلت قابل نفرت ہے۔ وہ اپنی تمام انشاء پردازی کی قوت کو ایسے لوگوں کی زندگی اور علوِ مرتبت بیان کرنے میں صرف کرتے ہیں، جیسے شیخ علائی (د۔ ۱۵۵) شیخ نیازی، شیخ جمال الدین جنھوں نے کلمہ حق کی حمایت کی اور دنیا دار علماء مثل مولانا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی کی فاسقانہ اور سیاہ کر حکمت عملی کی مخالفت کی۔

یہ دونوں علماء اُس طبقہ کے تھے۔ جس نے شریعت اسلامی میں ایسی فقہی تاویلات، غلط اجتہاد اور پاکیزہ اخلاق کے اصولوں سے عدم توجہی کو داخل کر دیا۔ مولانا آزاد اُن ہی حالات کا اعادہ اور تکرار اکبر کے زمانہ میں دیکھتے ہیں۔ جو اس سے پہلے زمانوں میں اللہ والوں کو برداشت کرنا پڑے۔ جیسے امام حسین علیہ السلام، شیخ سعید ابن مسیب، امام مالک، امام حنبل، امام ابن تیمیہ، وہ اپنے زمانہ میں شک، تذبذب اور بے دینی کی لعنت دیکھتے ہیں اور اُس کو ایسے شغف، سرجوشی اور کمال ذوق سے بیان کرتے ہیں کہ اُس کی مثال اُردو ادب میں نہیں ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اعلائے حق کرنے والے ہندوستان میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن شخصیتوں کے علاوہ جن کا ذکر آیا ہے۔ شیخ سلامی (د۔ ۱۵۴۹)، شیخ داؤد (د۔ ۱۵۷۴)، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس سے پہلے حمایت حق کی۔

الہلال کے سے دور کی تمام زندگی عمل صالح کے لئے وقف کرنے کی بدکاروں سے مقابلہ کرنے کے عزم کی اور اللہ کے فکر و غم میں شرکت کرنے کی ضرورت ہے۔ تذکرہ میں خاص طور پر اسلامی روایات کا ذکر ہے۔ اور مولانا آزاد کے ارتقائے خیال کا نسبتاً ایک غیر پختہ منزل ہے۔ جس میں اُن کی بعد کی تصنیف ترجمان القرآن کی عالمگیریت کم ظاہر ہوتی ہے۔ ان دونوں تصانیف کے درمیان یقیناً پندرہ برس کا تفاوت ہے۔ یہ دونوں قطعاً مختلف حالات میں لکھی گئی ہیں۔ یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ جس کیفیت مزاج میں تذکرہ لکھا گیا۔ اُس میں تبدیلی واقع ہو گئی ہو۔ مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات نے اس بات کو اُن پر واضح کیا کہ تصورِ حق و صداقت میں نیک کام کرنے کے فراخ تر میدان کا شامل ہونا روحانی ضرورت ہے۔ اور اس نے اُن کا تصورِ حق و صداقت اور زیادہ وسیع کر دیا ہو۔

لیکن واقعات ایک دوسرے رخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مولانا آزاد میں تبدیلی نہیں ہوئی وہ مسلم رہنما سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر نہیں بنے۔ تذکرہ سے اُس کیفیت مزاج کی تصویر نظر آ جاتی ہے۔ جس کیفیت میں وہ قومی تحریک سے نہایت موثر ہو گئے تھے کہ حق کی حمایت کریں اور اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کو شامل کریں جو اُن کی روحانی زبان سمجھتے ہوں اور عظیم اخلاقی روایات کی حمایت کرنے کے لئے طلب کئے جا سکیں۔ اُن کا تمام استدلال اپنے اندر وہ وعدہ مضمر رکھتا ہے۔ جو ترجمان القرآن کے اندر پورا ہوا، کلمۃ الحق کی تشریح اور تفسیر کا وعدہ۔ تذکرہ اور ترجمان القرآن ایک دوسرے کے متمم ہیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں تذکرہ نے تبلیغ عقیدہ کو اپنے خطیبانہ طرز بیان میں پیش کر کے، عالمگیر مقبولیت اور رفعت حاصل کی ہے۔

گوپی ناتھ امن لکھنوی

مولانا آزاد "غبارِ خاطر" کے آئینے میں!

یوں تو پچھلی صدی سے اب تک اُردو میں خطوں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے لیکن پچھلی صدی میں غالب کے خطوط (اُردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی) اور موجودہ صدی میں مولانا آزاد کے مجموعۂ خطوط (غبارِ خاطر) کو طرۂ امتیاز حاصل ہے دونوں کا اندازِ نگارش جُدا لیکن دونوں نے بات میں بات پیدا کی ہے۔ مولانا کی زندگی غالب سے کہیں زیادہ ہنگامہ خیز تھی اس لئے اُن کے خطوط میں جو نکات اور مسائل پائے جاتے ہیں وہ غالب کے ہاں نہیں۔ پھر بھی غبارِ خاطر میں مولانا نے سیاسیات کے تذکرہ سے گریز کیا ہے اگر کہیں اشارے ہیں تو اس انداز میں کہ مکتوب الیہ سمجھ جائے۔ غالب کے خطوط مختلف دوستوں، محسنوں، شاگردوں اور شاگردوں کے نام ہیں مولانا کے خطوط صرف ایک ہی ہستی کے نام یعنی صرف نواب صدر یار جنگ مکتوب الیہ ہیں۔ غالب نے گھر بیٹھے خطوط لکھے، مولانا کے ستر خطوط جن پر غبارِ خاطر مشتمل ہے، قلعہ احمد نگر کی نظربندی کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں یہ بھی ایک بڑا فرق ہے۔ یہ خطوط مکتوب الیہ تک پہنچتے نہیں تھے لیکن مولانا کے دل کی تسلی ہو جاتی تھی گویا ان کی یہ حالت میگھ دوت سے ملتی ہے جہاں ایک گندھرب بادلوں سے مخاطب ہو کر اپنے دل کے جذبات بیان کر دیتا ہے۔ مجھے خود بھی سزا یافتہ اور نظربند قیدی کی حیثیت سے جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ جیل کی زندگی جسے عام طور سے چار دیواری کی زندگی سمجھا جاتا ہے بڑی شدت کی زندگی ہوتی ہے بعض سیاسی قیدیوں اور نظربندوں کی طبیعت کے جوہر جیل میں کھلتے ہیں مولانا اس نظربندی کی حالت میں اپنے اصل روپ میں نظر آتے ہیں۔ ورنہ وہ عام نظروں میں یا مولوی ہیں یا سیاسی نیتا یا پھر اس کے بعد وزیرِ تعلیم اور ان میں سے ہر حیثیت میں اُن سے کہا جا سکتا ہے کہ

ع۔ رنج نالاکش کہ ارزانی ہنوز

ان خطوں میں مولانا کی انفرادیت نظر آتی ہے وہ آمادۂ جور زمانے کو للکارتا ہے کہ مجھے رُلا کر تو دیکھ دل دردمند رکھتا ہے اور نہ جانے کتنی لذّتِ غم کے مزے لیتا ہے اور چہرے پر شکن نہیں آنے دیتا (تو دیکھئے میں صیغۂ واحد حاضر میں لکھنے لگا) ہاں تو مولانا فرماتے ہیں:-

"جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں جہاں دوپہر ہر روز چمکے شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟"

اسی طرح سونے جاگنے کے معاملے میں لکھتے ہیں:-

"زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریکِ حال ہو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے اُلٹی ہی چال میرے حصہ میں آئی، دنیا کے لئے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا وہی میرے لئے بیداری کی اصل پونجی ہوئی لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ خوابِ شیریں کے مزے لیں میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت یاب

ہوتا ہوں۔

غلغلہ ہا بیدار باید بود تا پیچ چشم من
درین شب کہ نغمہ گرمی گرم گشت بیداری نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا میں نے دنیا کو ایسی خوش وقتوں کا شروع سے موقع ہی نہیں دیا وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو اٹھ بیٹھتا ہوں۔"

اس آخری جملے سے گیتا کے دوسرے ادھیائے کا یہ شلوک ذہن میں آ جاتا ہے جو مہاتما گاندھی کے وظیفہ شام و سحر میں داخل تھا

یا نشا سرو بھوتانام تسیام جاگرتی سنیمی
یسیام جاگرتی بھوتانی سا نشا پشیتو منیہ

(جو تمام مخلوق کے لئے رات ہوتی ہے اس میں جوگی جاگتا ہے اور جس میں عام مخلوق جاگتی ہے اُسے رات دکھائی دیتی ہے) یعنی اہلِ معنیٰ کے روزگار کی سحر و شام عوام سے الگ بلکہ متضاد ہوتی ہے۔

اسی انفرادیت نے مولانا میں بے پناہ قوتِ برداشت پیدا کر دی تھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مرزا غالب نے رنجِ گراں نشینی کی حکایتیں لکھی تھیں صبرِ گریز پائی کی شکایتیں کی تھیں۔

کبھی حکایتِ رنجِ گراں نشیں کہئے
کبھی شکایتِ صبرِ گریز پا کہئے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں نہ صبر کی گریز پائیاں ہیں کہ شاکی ہوں رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں صبر کی جگہ رنج کی گریز پائیوں کا تماشائی رہتا ہوں۔"

سب سے سخت امتحان کا وقت مارچ، اپریل ۱۹۴۳ء کا تھا مولانا کی گرفتاری کے وقت بھی اُن کی اہلیہ بیمار تھیں مارچ میں حالت زیادہ خراب ہو گئی اور اپریل میں رحلت فرما گئیں اس درمیانی دور میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور مولانا کے جیل کے ساتھیوں نے چاہا کہ کوئی سبیل نکالی جائے کہ مولانا رفیقۂ حیات کا آخری دیدار کر لیں مگر مولانا کی طبعِ غیور نے اسے گوارا نہ کیا مولانا لکھتے ہیں۔

"جس دن تار ملا اُس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بھیج دے گا۔ درمیان کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور اُن سے اس بارے میں گفتگو کی وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے میں نے اُن سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔" غالب کا یہ شعر غالب سے زیادہ مولانا کے کیریکٹر پر صادق آتا ہے

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

مولانا کے چند جملوں سے اُن کی اس انفرادیت کا اندازہ کیجئے۔

"لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہو سکے

در کوئے نا شکستہ دلی مے خرند و بس
بازارِ خود فروشی ازاں سوئے دیگر است

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

بار فیماں ز خود رفتہ سفر دست دہاد
سیرِ صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہو گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔"

جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے مولانا نے ۹ جنوری ۱۹۴۳ء کے

طامیں اس پر بحث کی اور اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تجارتی ادب کتنے عرسے یہی نہیں مگر خطیبانہ ادب اور عوامی ادب کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے سطے میں دنیا کی چند عظیم ہستیوں کے افکار کا جو جائزہ لیا گیا ہے وہ دنیا کے ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

مذہبی رواداری

مولانا مسلمان تھے خاندانی عالم تھے ترجمانِ قرآن فقہ و احادیث کے تمام رموز سے باخبر لیکن با ایں ہمہ وہ کٹر مُلّا نہیں تھے۔ چنانچہ اکتوبر ۲۲ء کے خط میں الٰہیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دنیا میں وحدت الوجود کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے غالباً یونان و اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید نے جسے غلطی سے عرب نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوری تشخصات سے منزہ کر کے ایک کامل مطلق تصور قائم کر دیتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ صفات متشکل نہیں ہو سکتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات و مظاہر کے اعتبار سے نہ کہ ذاتِ مطلق کی ہستی کے اعتبار سے۔ اس عقیدہ کا ہر شناس اُس کی ذات کے بارے میں بجز اس کے کہ ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھائیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو وہ ذاتِ مطلق مطلق نہیں رہتی متشخص اور تعینات کے حدود سے آلودہ ہو جاتی ہے بابا فغانی نے دو مصرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا ہے۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عینِ اوست
اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اُپنشدوں نے نفی صفات کی راہ اختیار کی اور تعبیر 'نیتی نیتی' کو بہت دور تک لے گئے لیکن پھر دیکھیے کہ اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذاتِ مطلق) کو ایشور (ذاتِ متصف و متشخص) کی شکل میں دیکھنے لگے بلکہ پتھر کی مورتیں بھی تراش کر سامنے رکھ لیں کہ دل کے اٹکاؤ کا کوئی ٹھکانا تو سامنے رہے۔

کرے کیا کعبہ میں جو سرِ بت خانہ سے آگہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی ہے واں اللہ ہی اللہ ہے"

مولانا کی تفسیر قرآن میں ان کی مذہبی رواداری ایسے بھرپور روپ میں نظر آتی ہے اس اعتبار سے ترجمان القرآن کا مقابلہ لوک مانیہ تلک کے گیتا رہسیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے والا حقیقی معنوں میں مذہبی آدمی ہو سکتا ہے فرقہ پرست کبھی نہیں ہو سکتا اسی خط میں مولانا نے آگے چل کر لکھا ہے "ہندوستان کے اُپنشدوں نے ذاتِ مطلق کو ذاتِ متصف میں اتارتے ہوئے جس مرحلے کا نقشہ کھینچا ہے مسلمان صوفیوں نے اُس کی سیر احدیت اور واحدیت کے مراتب میں دیکھی"

اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ مولانا ایک کٹر مُلّا کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ مولانا احمد نگر کے قلعہ میں جس کمرے میں نظر بند کئے گئے تھے اس میں چڑیاں بہت تھیں مولانا نے اُن میں سے چند کے نام بھی رکھ دئے تھے جس کا نام ملّا رکھا تھا اس کے متعلق لکھا کہ

"ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے جب دیکھو رہا ہی فرفر پھول رہی ہے اور سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے جو بھی سامنے آ جاتے دو دو ہاتھ کئے بغیر نہیں رہے گا گمان ہوتا ہے کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلہ کے اندر قدم رکھ سکے .. شہ زوروں نے بہت دکھائی مگر جلد ہی مقابلہ میں چت ہو گئے۔ جب کبھی فرش پر یا طاق شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سر و سینہ کو جنبش دیتا ہوا اور دبے پاؤں نظر ڈالتا ہوا فوراً موجود ہو جاتا ہے اور آتے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر اپنے تیور خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں چوں چاں چوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظ جامع کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔۔۔ فرمائیے اگر اس کا نام ملّا رکھتا تو اور کیا رکھتا؟" دوسرے جوڑے کا نام صوفی رکھا ہے اس کے صفات یوں بیان کرتے ہیں

"شاید اس کے مقابل ایک دوسرا چڑا ہے تعرف لاتتیا
کا مصداق، اسے جب دیکھئے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے
کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد
بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی نامانوس چوں کی آواز نکال دی

اور اس تمام پوں کا معنی ۔ معلوم کرنا کا یہیں ہو کہ ایک
ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی سر جھکائے اپنی حالت میں
گم پڑا رہتا ہو اور صرف کبھی سر اٹھا کے 'ہا' کر دیتا ہو۔

'ما نو بیدار شدی یا ارکسیدیم [illegible]
عشق کار [illegible] کہ سینہ وفغاں پیر کند

دوسرے پرندے اس کا یہ جواب دیتے ہیں گویا اس کی کم سخنی
سے عاجز آ گئے ہیں پھر اس کی زبان کھلتی نہیں البتہ لگاتار ہوں
پر کان لگا دیئے تو ان کی صدائے خاموش سنی جا سکتی ہے

در عطر یار [illegible]
[illegible]

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا"

چاء سگریٹ

کھانے پینے کے معاملے میں گاندھی جی اور مولانا آزاد کے نظریوں میں
بڑا اختلاف نظر آتا ہے گاندھی جی چاء کو زہر اور دل کی پھوٹی چینی کو سپید
زہر کہا کرتے تھے۔ لیکن مولانا نے چاء کی تعریف میں بائیس صفحے لکھ دیئے
گاندھی جی نے شکر کی جگہ گڑ استعمال کرنے کو کہا ہے۔ لیکن مولانا کو اس بات
پر تاسف آمیز حیرت ہے کہ جواہر لال ایسا شخص گڑ کھانا پسند کرتا ہے۔ فرماتے ہیں

"جواہر لال چونکہ مٹھاس کے سخت شائق ہیں اس لئے
گڑ کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں میں نے یہاں بار بار کوشش
کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لئے اس درجہ نمایاں
ہے انہیں بھی محسوس کراؤں لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کر
رہ گیا۔"

گاندھی جی سپید شکر کے اس لئے خلاف ہیں کہ اس کا غذائی جوہر
نکل جاتا ہے لیکن مولانا یہ چاہتے ہیں کہ چاء کے لئے جو شکر ہو وہ بلور کی طرح
بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو یعنی وہ معمولی چینی سے بھی مطمئن نہیں
کیونکہ ان کے نزدیک یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کئے ہوئے رس سے بنتی
ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے،
صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیئے جاتے ہیں، گاندھی جی اور مولانا آزاد
کا یہ اختلاف محض سطحی نہیں۔ بات یہ ہے کہ گاندھی جی کا نظریہ حیات زاہدانہ ہے
اور مولانا کا جمالیاتی۔ گاندھی جی سگریٹ کے بھی سخت خلاف ہیں۔ لیکن مولانا
فرماتے ہیں:

"میں نے چاء کی لطافت و تیزی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے
ترکیب دے کر ایک کیف مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے
میں چاء کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی معاً ایک سگریٹ بھی
سلگا لیا کرتا ہوں پھر اس ترکیب خاص کا نقش عمل یوں جماتا ہوں
کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چاء کا ایک گھونٹ لوں گا اور
متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔"

اس معاملے میں جب گاندھی جی اور مولانا کے نظریوں یا عمل کو سامنے
رکھئے تو یہ نظر آتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی روش دونوں کے بیچ بیچ ہے۔
مولانا نے خود اس چاء اور سگریٹ کے بارے میں فرمایا ہے کہ آپ کہتے ہیں
چاء کی عادت ہو جائے تو ایک علت تھی اس پر مزید علت بڑھائے تا قرجام کا
اصرار کیوں کیا جائے۔ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا
طریقہ کام میں لا، علتوں پر علتیں بڑھاتا گیا حکایت بادہ و تریاک کو تازہ کر
رہے میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں حاشیہ زندگی کی غلطیاں
ہیں داخل ہیں لیکن کیا کہوں جب کبھی معاملہ کے اس پہلو پر غور کیا طبیعت
اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگار خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کیلئے
کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں۔"

اس پر بے ساختہ برنارڈ شا کی وہ بات یاد آ جاتی ہے جو انھوں نے
گاندھی جی کی شہادت پر کہی تھی کہ اس دنیا میں ضرورت سے زیادہ نیک
بھی خطرناک ہے۔

قوتِ حافظہ

مولانا نے جس طرح ان خطوں میں عربی، فارسی، اردو کے اشعار
اور مصرعوں کو جا بجا نقل کیا ہے اس سے ان کے حافظہ کی داد دینی پڑتی ہے
ظاہر ہے کہ جیل میں تو ان کے پاس وہ کتابیں نہیں تھیں جن کے اشعار
نقل کئے گئے ہیں لیکن مولانا نے اپنی یادداشت کے بل پر حوالے دیئے اور
دیئے۔ لوک مانیہ تلک نے جب گیتا رہسیہ جیل میں لکھی تھی تو انھوں نے
حوالے دیئے مگر حوالوں کی جگہ اس لئے چھوڑ دی تھی کہ جیل سے باہر آ کر

تھے۔ نہ جانے کیوں مولانا کو خیال ہوا کہ ڈائمنڈ ہاربر ملا جائے اور سمندر کی سیر کی جائے۔ اسکیم طے پا گئی۔ موٹر میں پٹرول بھرا گیا اور مولانا کے ساتھ میں قاضی نورالاسلام اور ڈپٹی قمرالدین بیٹھ گئے۔ موٹر چل پڑی۔ ڈائمنڈ ہاربر کلکتے سے ۳۰-۴۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ موٹر اڑی چلی جا رہی تھی۔ دفعتاً رک گئی۔ کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ ڈرائیور نے پوری کوشش کی مگر بے سود۔ آخر اعلان کر دیا موٹر چل نہیں سکتی۔ ہم لوگ کلکتے سے بہت دور ایک اجاڑ جگہ پر تھے۔ ۱۰-۱۲ منٹ چل کر ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچ سکتے تھے۔ آخر جانا ہی پڑا۔ مگر یہ اسٹیشن چھوٹی لائن کا تھا۔ بڑی کوفت ہوئی لیکن کرتے تو کیا کرتے۔ مجبوری کے ایسے موقعوں پر مولانا اپنے آپ کو سنبھال کے ایسے بن جاتے تھے جیسے کوئی پریشانی نہیں ہے اور لطائف و ظرائف کے نہ ختم ہونے والے خزانے کھل جاتے تھے

غرض ہم ایک کورده مقام میں تھے اور چھوٹی ریلوے کے اسٹیشن سے ساتھ تھا۔ طے پایا تھا کہ سمندر پر پہنچ کر کھانے پینے کی فکر کریں گے۔ مگر اب ہم سمندر سے دور یہاں تھے۔

یوں تو بھوک نہیں لگتی لیکن معلوم ہو جائے کہ کھانے کا سامان ملنا نہیں تو بھوک ٹوٹ پڑتی ہے۔ اب ہم سخت بھوکے تھے۔ ڈپٹی قمرالدین کی عمر ۸۰-۸۹ سے کیا کم ہوگی۔ سب سے زیادہ بھوک میں مبتلا وہی تھے۔ خود مولانا بھی بھوکے تھے مگر ظاہر کیسے کرتے۔ اسٹیشن پر کسی قسم کا کوئی کھانا نہ تھا۔ اب ہم کریں تو کیا کریں۔ بڑی مایوسی سے دوچار تھے۔ دفعتاً ایک لڑکا نمودار ہوا سر پر ٹوکری اٹھائے۔ ہم سب اس پر ٹوٹ ہی تو پڑے۔ صرف مولانا اپنی جگہ پر کھڑے مسکراتے رہے۔ ٹوکری اتروائی تو بالکل پکے امرود نکلے۔ ڈپٹی صاحب خوشی سے چیخ اٹھے پوری ٹوکری خرید لی گئی۔ میں نے عرض کیا کہ میکش پہ کیجئے امرود آپ کھا سکیں گے دانت کہاں ہیں ڈپٹی صاحب نے فرمایا۔ میاں نے میری ہی نگلے جیسے جائیں گے۔ مولانا اس نظارے سے پورا لطف اٹھا رہے تھے۔ مگر آخر بھوکے تو تھے ہی امرود اں پر وہ وہ ہاتھ مارے کہ آج تک یاد ہے۔ امرود چٹ کرنے سے کچھ تسلی ہو گئی۔ مگر ریل آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ گرمی سخت تھی اور ہم پسینے سے شرابور مگر مولانا پر اس آفت کا ذرا اثر نہ تھا۔ ٹہلوں پر ٹہلیں کرتے چلے جاتے تھے اور جب سنجیدہ ہوتے تو مناسب موقع کوئی تاریخی واقعہ سنانے لگتے یا پھر کلام اللہ کی کسی آیت پر موتی لٹانے لگتے۔

یہ واقعہ ہے کہ مصیبت کے اس زمانے میں مولانا کی رنده دلی اور رقائیت دیکھ کر میں عش عش کیا کرتا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس شخص میں کیسی قوت برداشت ہے، خدا پر کیسا بے حد بھروسہ ہے۔ آدمی مصیبت میں ہی پہچانا جاتا ہے اور مولانا ہر مصیبت میں خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، سرفراز ہی رہے۔

لیکن ابھی ایک مضحکہ خیز واقعہ اس داستان کی تکمیل کے لئے باقی ہے۔ اُکتا دینے والے کئی گھنٹوں کے بعد خدا خدا کر کے ریل گاڑی آئی اور ہم سوار ہو گئے۔ چیونٹی کی چال چل کر ریل نے ہمیں کلکتے کے مضافات خضرپور میں اتار دیا۔ ہر چند تلاش کرتے رہے کوئی ٹیکسی نہ ملی۔ اب شام ہو رہی تھی مجبوراً ٹرام گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔ مولانا ٹرام کی بنچ کے بالکل کنارے اس طرح بیٹھے تھے کہ گویا کہ بالکل تیار ہیں۔ بیٹھے نہیں ہیں یوں سمجھئے کہ بنچ پر ٹکے ہوئے تھے اور گھبرا کر ہر طرف دیکھتے جاتے تھے کہ کسی کی نگاہیں تو نہیں پڑ رہی ہیں۔ بالکل گم سم تھے۔ ایک اسٹینڈ آیا اور ٹرام ٹھہر گئی۔ ایک دو مسافر داخل ہوئے۔ ٹرام ابھی حرکت میں نہیں آئی تھی کہ ایک مسافر نے زور سے نعرہ مارا "السلام علیکم مولانا" ساتھ ہی ہاتھ پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔ اب مولانا کی حالت ایسی ہو گئی جیسے دق کا کوئی بیمار آخری مرحلے میں ہو۔ چہرہ بالکل سفید، ہونٹ بھنچے ہوئے، آنکھیں بھی کسی قدر نم بجھے ہیں اس آفت ناگہانی معتقد نے فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ میرے بھائی۔" پھر مجھے بڑی بے بسی کی نظروں سے دیکھا۔ میں تو مزاج آشنا تھا ہی، اٹھ کھڑا ہوا اور ٹرام کی رسی زور سے کھینچ کر پوری طاقت سے گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ ایک آدھ منٹ کے اندر ٹرام رک گئی۔ ہم سب اتر پڑے اور مولانا نے فرمایا۔ "سخت کوفت اٹھانا پڑی، ہم ٹیکسی کا انتظار کریں گے۔" ٹیکسی جلد مل گئی اور ہم گھر پہنچ گئے۔ مگر اس واقعہ کا چرچا مولانا نے مہینوں اپنی خاص وضع سے جاری رکھا۔ اتنا ہنسایا اتنا ہنسایا کہ اب کیونکر بیان کروں۔

مولانا آزاد کا ایک خط

قلعہ احمد نگر

۱۱- اپریل ۴۳ء

آنچہ دل از نشتر آں می سوخت بیم ہجر بود
آخر از بے مہری گردوں بہ آں ہم ساختیم

صدیق مکرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں بلکہ رات کا پچھلا حصہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسب معمول بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اٹھ بیٹھا، کمرے میں آیا، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کر دوں۔ ان آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اس طرح گزریں گی۔

دماغ بر فلک و دل بہ پائے ہمسر تاں
چگونہ حرف زنم دل کجا دماغ کجا

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوگا۔ مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔

اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش ست

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتے کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور پھر چار دن بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا

چلنے لگا۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالات نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر کچھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو ہمیں دو سفروں کے درمیان مل گئے تھے اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لئے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳۔ اگست کو صبح میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳۔ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ ہستی تو خاموش کردہ ایم

گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

لہ گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ اور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اور اس غرض سے بعض انتظامات کر بھی لئے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی اور مناسب سمجھا گیا کہ قلعہ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقع پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو ۱۷ ستمبر کو مجھے اس کا پہلا خط ملا۔ اس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی۔ اس لئے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالات دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لئے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہو سکتی۔ ۱۵۔ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیئے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لئے ابتدا سے یہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلیگرام باہر بھیجا جا سکتا ہے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلیگراف آفس ہی کے ذریعہ آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر

تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیئے وہ اسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا وہاں سے احتساب کے بعد سے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لئے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے چونکہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لئے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خط رمز (Code) میں لکھا گیا تھا سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈکوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لئے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آ چکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اطلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سنتا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی

جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا اس سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تا دستِ رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق آنے نہ پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرہ سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے جونہی اس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کسی خبر اخبار میں ہے گی لیکن پھر میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف ہے۔ اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے۔

اور پھر کیسے ہیں مشغول ہو جاتا گویا اب دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے ماں کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس سے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے صبر و وقار پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دلے کیں صورت بے حالی ہی جو اہم

بالآخر ۹ - اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فانقضٰی ما قضٰی دُری تقدیر ا

۴ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی۔ اور اس نے یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طرزِ عمل رہا اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر انہیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں لیکن جونہی انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اس طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل بہ ذرہ راہ روی آہ چارہ نیست

دریں رہ ہزار ماں کہ دلِ آگاہ ہی زند

یہاں احاطے کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئی طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔

لقد لامنی عند القبور علی البکا ... رفیقی لتذراف الدموع السوافک

فقال اتبکی کل قبر رأیتہ ... لقبرٍ ثوی بین اللوی فالدکادک"

فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا ... فدعنی فھذا کلہ قبر مالک"

اب قلم روکتا ہوں اگر آپ سنتے ہوتے تو دل اُٹھتے

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر

اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانہ میں

(غبارِ خاطر سے)

فاتحۃ السنۃ الثالثہ

جو رسالہ بات انسان کی غذائے جسمانی کا سب کچھ سامان رکھتا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس کی روحانی غذا کا انتظام نہ کرے۔

روحانی غذا کیا ہے۔ یہ ہدایت و سعادتِ انسانی کی دعوتِ الٰہیہ ہے جس کے لئے فی الحقیقت روحِ انسانی بھوکی پیاسی ہوتی ہے۔ اور جس طرح جسم جسمانی لذتوں کی بھوک اور پیاس کے لئے بے قرار و مضطرب ہو کر غذا کو پکارتا ہے اسی طرح ضلالت کی شدت اور ہدایت کا فقدان بھی روحِ انسانی کو ایک معنوی جوع و عطش میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے لئے اسی غذا کو دیوانہ وار پکارنے لگتی ہے۔ پس وقت آتا ہے کہ اس حکیم علی الاطلاق، اس فاطر الارض والسماوات، اس مدبر الامر والاشیا اور اس مسبب الاسباب حقیقی کی ربوبیت ظاہر ہوتی ہے جس نے انسان کی حیاتِ جسمانی کے لئے تمام دنیا کو طرح طرح کے اغذیہ و ثمرات کی بخشش سے ایک خوانِ کرم بنا دیا ہے اس کا دستِ کرم بھی غذائے روحانی کا پیچ لاتا ہے اور اپنی نشو و نما سے اسے یکایک سرسبز و بالا قامت بنا دیتا ہے۔ پھر اس کی سعادت و ہدایت کی نعمتوں سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بھر جاتے ہیں اور اس کشش کی دعوت سے ارضِ الٰہی گونج اٹھتی ہے۔" (الہلال ۱۳ جنوری ۱۹۱۳ء)

یحییٰ اعظمی

آہ مولانا ابوالکلام آزادؒ

جس کی زباں کا حرف حرف، لمعۂ جاں نوائے راز　　دفترِ علم و آگہی نوکِ قلم سے جس کے باز
شانِ حیات جس کی تھی اوجِ شرف سے سرفراز　　عرشِ کمال و فضل تھا جس کا مقامِ امتیاز

نشاۂ تازہ جس نے دی قوم کو وہ ابوالکلام
نامِ حریمِ قدس تھا جس کی حیات کا مقام

پیکرِ عزّت و شرف، مظہرِ عظمت و جلال　　بینشِ نظر منظرِ فروز ایک مرقعِ جمال
خازنِ فضل و علم و فن، حاتمِ دانش و کمال　　قاسمِ بادۂ کہن، ساقیِ دورِ الہلال

اُٹھ گیا وہ تو بے فروغ مصطبۂ یقیں ہے آج
پیرِ مغاں کے ہجر میں بزمِ مغاں حزیں ہے آج

حیف خموش ہو گیا باغِ ادب کا عندلیب　　اٹھ گیا ہند کا امام سو گیا قوم کا خطیب
اب نہ اٹھے گا حشر تک ایسا مفکر و ادیب　　حق کا مجاہدِ جلیل، دیں کا منادی و نقیب

فکرِ جدید و طرزِ نو کا وہ محقق کتاب
جس کے صحیفۂ کلام کا نہیں دہر میں جواب

ایک حریمِ راز تھی اس کی کتابِ زندگی ۔۔۔ فکر و نظر سے تھی بلند اس کی جنابِ زندگی

آج کہاں ہے دہر میں اس کا جوابِ زندگی ۔۔۔ آہ برس کے تھم گیا اب وہ سحابِ زندگی

بکھرے ہوئے ہیں چار سو لعل و جواہرِ کمال

اس کے مآثرِ ہنر ، اس کے مظاہرِ کمال

اس کا قلم جب اٹھ گیا لالہ و گل کھلا دیا ۔۔۔ شعر و ادب کے پھول سے صحنِ ورق سجا دیا

شاہدِ فکر و راز کے رُخ سے حجاب اٹھا دیا ۔۔۔ جلوۂ رنگ رنگ سے گل کدہ جگمگا دیا

عقدہ کشائے فکر و راز چہرہ طرازِ علم و فن

فیض سے جس کے تازہ تھا دانش و فکر کا چمن

آہ وہ کلکِ خوش نگار، لالہ طراز و لالہ کار ۔۔۔ جس کا نوشتہ ہے ایک صحیفۂ بہار

جس کی نگارشِ جمیل شعر و ادب کا شاہ کار ۔۔۔ ایک حدیقۂ کمال جس کا ہر اک خطِ غبار

اس کا "حبیب" سے کلام اس کا "صدیق" سے خطاب

نامۂ شوق کی زبور، نغمہ و شعر کی کتاب

علم و ہنر کا تاجدار، خسروِ کشورِ قلم ۔۔۔ بدرِ معانی و علوم، صدرِ معارف و حکم

نوکِ قلم سے گل طراز، نغز نگار و خوش رقم ۔۔۔ جس کا کمال معتبر جس کا کلام محترم

قوم کو جس پہ ناز تھا ہاں وہ زعیمِ ممتحن

ایک حکیمِ دیدہ ور ایک کلیمِ طورِ فن

سجنِ فرنگ کا اسیر، قائدِ صاحبِ ضمیر ۔۔۔ جس کے ثباتِ عزم کی ملتی نہیں کوئی نظیر

شیخِ بلند کا فقیر، فکر و دماغ کا امیر ۔۔۔ تھا جو وطن میں کل تلک نظمِ امور کا مشیر

کنجِ لحد میں گوشہ گیر ہو گیا آہ اب وہی

اس کے الم میں سرنگوں کیوں نہ ہو پرچمِ خوشی

اسوۂ یوسفی کی نذر جس کی حیات تھی تمام — حق کے لئے غم و محن جس کا تھا منصب و مقام
شکر و رضا کی سرخوشی جس کا شعار تھا مدام — دار و رسن سے سرفراز، قید و محن سے شادکام

صبرِ جمیل کی ادا جس کی تھی شانِ امتیاز
عفو و کرم سے دل نواز، جور و ستم سے بے نیاز

آہ کہاں ہے آج اس شانِ فہیم کی مثال — طبعِ کریم کی مثال خلقِ عظیم کی مثال
اب نہ اٹھے گی ہند میں ایسے زعیم کی مثال — ایسے نفیس دیدہ ور ایسے حکیم کی مثال

آج ہے بے فروغِ فیض بزمِ وطن ترے بغیر
بزمِ وطن ہے محفلِ حرمان و محن ترے بغیر

اس کی حیات کو تھا آہ ملتِ حق سے یہ گلہ — بے خبرِ مقام ہے ہند میں حق کا قافلہ
فکر و شعور سے تہی جس کا ہے عزم و حوصلہ — رزمِ حیات سے فرار آہ ہے جس کا مشغلہ

جہلِ خطاب سے دیا جس نے سلام کا جواب
سوءِ کلام سے دیا حسنِ کلام کا جواب

جس نے کیں تازہ سنتیں سرکشیٔ عناد کی — حق کے خلاف بے پناہ معرکۂ جہاد کی
آہ وہ گرم جوشیاں ملتِ کم سواد کی — آہ وہ شانِ صبر و شکر بندۂ حق نہاد کی

گالیاں سن کے بھی مدام لب پہ دعائے خیر تھی
عفو و کرم کی کل متاع یعنی منتہائے خیر تھی

اب نہ اٹھے گا عارفِ دینِ حجاز پھر کبھی — آہ ابوالکلام سا واقفِ راز پھر کبھی
ہوگا نہ عندلیبِ فن نغمہ طراز پھر کبھی — دفترِ علم و معرفت ہوگا نہ باز پھر کبھی

آہ نہ جانی اس کی قدر ملتِ کم شناس نے
مسلمِ کم سواد نے، امتِ ناسپاس نے

غلام رسول مہر

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک نادرِ روزگار شخصیت

ماجرا گرہ از زلفِ یار باز کنید
شبے خوش است بدیں قصہ اش دراز کنید

مولانا کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے بہت کم ایسے آدمی ہیں جن کے متعلق ان کی زندگی میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہوں جتنی مولانا کے متعلق شائع ہوئیں۔ جب تک روز و شب کا سلسلہ [illegible] جاری ہے بہت کچھ لکھا جائے گا، تاہم حقیقتِ حال پر نظر رکھی جائے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

ترا چنانکہ توئی، ہر کسے کجا داند
بقدر طاقت خود ہر کسے کند ادراک

انسانوں کے درجے

عظیم الشان انسانوں کے مقامات و مدارج بھی اس بنا پر متعین ہوتے ہیں کہ زمانی اور مکانی اعتبار سے ان کے دائرۂ اثر و رسوخ کی کیا کیفیت رہی، بعض افراد خاص اسباب کی بنا پر شہرت پا لیتے ہیں اور ان میں مقامِ شہرت پر قائم رہنے کے جوہر موجود نہیں ہوتے۔ بعض کو قدرت عزت و احترام کی اوج گاہوں پر پہنچا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنے مخصوص ماحول سے باہر کوئی قابلِ ذکر حیثیت حاصل نہیں کر پاتے یا ان کی قدروں کو زمانی اعتبار سے چنداں پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ خاکدانِ تیرہ و تار ایسی شخصیتوں کی جلوہ گری سے بھی زیب و زینت پاتا ہے جو زمان و مکان کے لوحِ قلب پر اپنی عظمت کے گہرے نقوش ثبت کر جاتی ہیں۔ لیل و نہار کے وہ نقوش مدھم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ ابھرتے رہتے ہیں۔ مولانا کا تعلق عظیم المرتبت انسانوں کی اسی آخری صف سے تھا اور ایسے انسان زمانے کے دور گزر جانے کے بعد ہی عرصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔ خواجہ سنائیؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب کہا تھا کہ:

دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراسان یا اویس اندر قرن

نادرِ روزگار شخصیت

یقیناً مولانا ایک نادرِ روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گوناگوں اوصاف و محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا شمار مشکل ہے اور ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لیے بھی دائمی فخر کا سامان ہو سکتا ہے۔ علم و فضل، حقائقِ دین، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت، اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و ملک داری، غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلّم نہ رہی اور آج تک اس کی تصدیق و توثیق نہ ہوتی رہی، عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں علوم کا شاید ہی کوئی قابلِ توجہ مطبوعہ یا مخطوطہ ذخیرہ ہو

بھی ان کی نظر سے گزر چکا تھا اور اس دور کے ہر مستند اقتباسات ان کے حیطۂ
حفظ و ضبط میں محفوظ رہے۔ لوگوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور ان کے وہ
مطالب ذہن میں بٹھا لئے جو انھیں پسند آئے۔ مولانا کے حافظے میں محض تمام
مطالب ہی محفوظ نہ تھے بلکہ مشہور مصنفوں کے اسلوب پر بھی حد درجہ گہری نظر تھی
جب اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسے حقائق بیان فرماتے جو اس فن میں درجہ
اختصاص حاصل کرنے والوں کی زبان سے بھی بہت کم سننے لگے۔ حیرت اس
بات پر ہوتی تھی کہ یہ کمال انھوں نے کیونکر حاصل کر لیا۔

حیرت انگیز کمالات

عربی تو بہرحال ان کی مادری زبان تھی اور حیات مستعار کے ابتدائی
دس سال انھوں نے مکۂ معظمہ میں گزارے تھے لہٰذا اسے اہل زبان کی طرح
بولنے پر قدرت ہونا چاہئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ فارسی بھی تازہ وارد
ایرانیوں کے انداز میں بولتے تھے۔ مشہور ایرانی شاعر قاآنی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ
فرانسیسی زبان فرانسیسیوں کی طرح بولتا تھا یہاں تک کہ اسے پردے میں بٹھا دیا جاتا تو کوئی
بیان نہ کر سکتا کہ فرانسیسی نہیں ایرانی بول رہا ہے۔ جیسے ایک مرتبہ مولانا کو ایک ترک مہمان سے
فارسی میں باتیں کرتے سنا تو حیران رہ گیا۔ گفتگو میں اہل زبان کی سی روانی
کے علاوہ تلفظ کی نظافت اور لب و لہجہ کی ملائمت کا وہی رنگ تھا جو خوش
ذوق ایرانیوں کا خاصہ ہے۔

علوم میں ہمہ گیری

ہر مختلف انسانوں کی طبیعتوں کو مختلف علوم سے مناسبت ہوتی ہے
اور انہیں میں وہ درجۂ کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ مولانا کی طبیعت کو ہر علم سے
مناسبت تھی۔ دین و مذہب، تاریخ و سیر، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب،
علم الالسنہ، آثار قدیمہ اور خدا جانے کس کس دائرۂ علم و فن میں وہ یگانگی
کے درجے پر فائز تھے۔ یہاں تک کہ طب کی تعلیم بھی باقاعدہ پائی تھی اور دوسرے
علوم کے علاوہ طب بھی پڑھاتے رہے۔ جو کتاب ایک مرتبہ نظر سے گزر جاتی
تھی، اس کے تمام مطالب ذہن میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ عربی، فارسی اور
اردو شعرا کے تذکرے اور دواوین انھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دیکھے
ہوں گے۔ شاید ہی کوئی اچھا اور قابل توجہ شعر ہو جو انھیں یاد نہ تھا۔ ہم لوگوں
نے جن اردو شعرا کے محض نام سن رکھے ہیں اور ان کا کلام کبھی نہیں دیکھا، جب
سمجھ کر اپنے خیال کے مطابق اسے دیکھنے کے قابل نہ سمجھا۔ مولانا کی تصانیف میں
ان کے اشعار بھی جا بجا ملتے ہیں۔ کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ انھیں یہ تمام ذخیرے
دیکھنے جانے کا وقت کب ملا اور پھر اردو کی گراں قدر کتابوں کے مطالعے سے
اتنی فرصت کیونکر میسر آ گئی کہ ان کتابوں کو بھی نظر سے گزار لیا۔ جن کے وجود
تک سے اہل علم بے خبر ہیں۔ یہی حال بائبل کی ایک کتاب تکی روٹی ہے جس
میں دینی مسائل سوال و جواب کے انداز میں جمع کئے گئے ہیں۔ قیام امرتسر
کے دوران میں انھوں نے وہ کتاب بھی پڑھ لی تھی۔

غیر معمولی حافظہ

صلاحیت حفظ و استحضار کے لحاظ سے وہ قدرت کا ایک عجیب و
غریب نشان تھے۔ بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ پڑھتے تھے، دماغ کے
مختلف خانوں میں ترتیب سے محفوظ ہوتے جاتے تھے۔ ہر خانہ ضرورت کے وقت
خود بخود کھل جاتا اور موتی چن لیتے۔ "تذکرہ" انھوں نے صرف حافظے
کی بنا پر مرتب فرما دیا تھا۔ بعد میں چند کتابیں منگوا لیں تاکہ اطمینان فرما لیں
جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں غلطی تو نہیں ہوئی۔ اس کتاب کی دو جلدیں تھیں۔ مرحوم
فضل الدین احمد مرزا نے صرف ایک جلد چھاپی اور مولانا ابھی رانچی میں نظر بند
ہی تھے کہ مرزا صاحب کلکتہ چھوڑ کر اپنے وطن پنجاب چلے آئے اور دوسری
جلد بھی ساتھ لے آئے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور سعی و تلاش کے باوجود دوسری
جلد کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اسی طرح ایک عزیز دوست سے سنا کہ جس زمانے میں مولانا "وکیل"
کے ایڈیٹر تھے، طباطبائی مرحوم کی شرح دیوان غالب میں انھوں نے سادہ
اوراق لگوا لئے تھے اور ان پر مختلف شعروں کی شرح لکھتے جاتے تھے۔ ایک بہم
سے وہ نسخہ مولانا کے علم کے بغیر اٹھا لیا اور تقسیم ہند کے وقت تک وہ محفوظ
تھا۔ تقسیم کے ہنگاموں میں وہ نذر آتش ہو گیا۔

خدا کی خاص نعمت

"غبار خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور میں اس کی نگرانی پر مامور
تھا۔ ایک مکتوب میں اپنے محبس احمدنگر کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اسی احمدنگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی
کا وہ واقعہ نمایاں ہوا جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی
(صاحب مآثر رحیمی) اور صمصام الدولہ (صاحب مآثر الامراء)
نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمدنگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ

کی فوجیں بھی آگئیں، اورخاں خاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل جیشی کی طاقت ور فوج سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا۔ جس امر کے درپیش وضع آسمانی اگر حادثہ رو دہد جائے نشاں دہید کہ تا ما دریابیم"، خان خاناں نے جواب دیا تھا" دیدہ شد"

میں نے فارسی کا یہ فقرہ پڑھا تو احساس ہوا کہ فتح آسمانی اچھی فارسی معلوم نہیں ہوتی، ممکن ہے اصل میں "فتح آساں نے" (فتح آسان نہیں) ہو۔ میری گذارش کے جواب میں مولانا نے کلکتہ سے لکھا۔

"دولت خاں لودی کا مقولہ محض حافظے سے لکھا ہے لیکن اس میں "فتح آسمانی" ہی ہے۔ یعنی حالت ایسی ہے کہ سرو ساماں کی بنا پر فتح کی اُمید نہیں کی جاسکتی آسمان کی مدد ہی سے ہو تو ہو "آساں نے" ہرگز نہیں ہوسکتا اگرچہ دماغ مطمئن تھا خیال ہوا برسوں کی بات ہے۔ اصل مقام نکال کر دیکھ لوں۔ چنانچہ "مآثر الامرا" میں مقام مل گیا اور دولت خاں لودی کا مقولہ ٹھیک ٹھیک وہی نکلا جو حافظہ میں محفوظ رہ گیا تھا۔ طبیعت خوش ہوئی کہ تیس برس تک دماغ نے اس معوے کی پوری محافظت کی تھی اور ایک نقطہ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوا تھا۔"

کون اس حافظہ کو خدا کی خاص نعمت تسلیم کرنے میں تامل کرے گا جس نے تیس برس میں ایک معمولی فقرے کا ایک نقطہ بھی اِدھر اُدھر نہ ہونے دیا۔

ہر دائرے میں مستقل قدریں

اسے بھی چھوڑ دیجئے اور یہ دیکھئے کہ ہر دائرے میں انھوں نے مستقل قدریں قائم کیں۔ جن کا کوئی سراغ ان سے پیشتر کسی دائرے میں نہیں ملتا۔ اگر میں اس بارے میں تفصیلات پیش کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے تاہم ایک دو مثالیں پیش کئے بغیر مدعا واضح نہیں ہوسکتا۔

"الہلال" سے پیشتر تمام جرائد و رسائل (الاماشاء اللہ) امراد رؤسا سے اعانتی رقوم لے لینا غیر مناسب نہ سمجھتے تھے بلکہ مدت کا اشتہار چھاپا جاتا تھا تو امرا و رؤسا کے لئے زیادہ رقم لکھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے دریچۂ استغنا میں کوئی خلل نہ آسکے۔ "الہلال" نکلا تو اس کا پہلا ہی نمبر دیکھ کر ایک مشہور صاحبِ ریاست نے خاص رقم کا چیک مولاناؒ کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ ہی لکھا کہ ہر مہینے اتنی رقم باقاعدہ پہنچتی رہے گی۔ سال بھر کے لئے تو وعدہ کیجئے اس کے بعد بھی اخبار اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہوسکا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

سیر چشمی اور خودداری

مولانا نے تشکریے کے ساتھ چیک واپس کر دیا اور لکھا۔

"ہم نے جس قدر کام اپنے ذمے لے لئے ہیں۔ وہ روپے کے بل، پبلک کی قدردانی اور ذوساتے قوم کے جود و سخا کے بھروسے پر نہیں بلکہ صرف اس کے فضل اور توفیق کے اعتماد پر جو اپنے دروازے کے سائلوں کی فریادیں جب ایک مرتبہ سن لیتا ہے تو پھر دوسروں کی چوکھٹوں پر کبھی نہیں بھیجتا۔"

پھر فرمایا۔

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ افسوس کی اعانت کر کے آپ کا جی کیا خوش ہوگا۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں

"مجھ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے، اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم ایک گراں قدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت میں گھاس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں.... ہاں اگر اس سے میری رائے اور میرا ضمیر خریدنا مقصود ہو تو بہ ادب واجب عرض ہے کہ ان حروفِ بے جا نظامی کی تو کیا حقیقت ہے، اگر وہ اور تخت طاؤس کی دولت بھی جمع کر لیجئے تو مع آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے ہیچ ہیں۔ یقین کیجئے کہ اسے تو سوائے شاہنشاہِ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک مرتبہ خرید چکا۔"

کم از کم اردو اخبار نویسی میں میرے علم کے مطابق عظمتِ خودداری کی یہ پہلی صدائے حق تھی جس نے اس اخبار نویسی کے معیار کو آسمان پر پہنچایا۔

"الہلال" کی ضمانت کا واقعہ

طلبِ ضمانت کا خیر مقدم "الہلال" سے پیشتر کبھی کسی اخبار نے نہ کیا تھا۔

"الہلال" سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولاناؒ نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا۔ جب اطراف ملک سے پے در پے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا۔ "اللہ سے عشق" ساتھ ہی فرماتے ہیں:۔

"انسان صرف کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ بس اس کو چاہئیے کہ اپنے کام میں معروف رہے۔ یہ بہت ہی ادنے اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکام وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔"

اس ضمن میں یہ اصول پیش کر دیا کہ حق و صداقت کے لئے کامیاب و منصور ہونا لازم ہے۔ باطل کے ساتھ دنیوی طاقتوں کا کتنا ہی ساز و سامان ہو اور وقتی کامیابیاں اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دیں لیکن بالآخر وہ خاسر و نامراد رہے گا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ۲۸ ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ جسے ۲۰۔ تک داخل کرنے کی مہلت تھی، لیکن ۲۲ ہی کو داخل کر دی گئی۔

"ضمانت کا روپیہ تو اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علٰحدہ رکھ دیا گیا تھا۔ جس دن "الہلال پریس" کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے اور اب وہ وقت آگیا تھا اگر کوئی مانگنے کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے۔ بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومیٔ قسمت سے مہلت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوئی تو آیندہ کی فکر کے لئے ہمیں وقت کب ملے گا؟"

قول فیصل

ایسی بے شمار قیدیں مولاناؒ نے ہر دائرے میں قائم کیں اور ان سے پیشتر ہماری قومی زندگی میں ان کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ وہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں سلسلہ ترک موالات گرفتار ہوئے تھے۔ اور ملت کے قومی فیصلے کے مطابق اصول سے بھی دوران مقدمہ میں عدالت سے تعاون نہ کیا تھا۔ البتہ آخر میں ایک بیان داخل کیا تھا جو قول فیصل کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ آج بھی موجود ہے۔ ہندوستان میں چھوٹے بڑے ہزاروں افراد گرفتار ہوئے تھے اور بے شمار لوگوں نے تحریری بیانات دیئے تھے۔ مگر کوئی بیان "قول فیصل" کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ مجاہدین آزادی کے خلاف مقدمے ہر ملک میں چلے اور اکثر نے بیانات بھی دیئے۔ میرے علم کے مطابق آئرلینڈ کے قائد آزادی رابرٹ ایمٹ کا بیان بہت بلند اور پر تاثیر مانا جاتا ہے۔ لیکن "قول فیصل" کے مقابلے میں بھی وہ بالکل بے کیف معلوم پڑتا ہے۔ مولانا نے اس میں حقیقت حال واضح کی، آزادی کے لئے ہر جد و جہد کا اقرار کیا بلکہ کہا میں اس جرم کا ارتکاب بہت پہلے سے کر رہا ہوں اور اسے اساسی انسانی حق قرار دیا۔ پھر اسا یہ بھی واضح کر دیا کہ حق کامیاب ہوگا اور باطل اپنی ظاہری قوت کے باوجود ٹھہر نہ سکے گا۔ دنیا جانتی ہے کہ حالات نے مولانا کے اسی یقین کا ساتھ دیا۔ خدا کی سنت کبھی نہیں بدلی، قدرت کے مقرر کئے ہوئے اصول کی کارفرمائی میں کبھی تغیر نہیں ہوا لیکن یہ بول بول لینا ایک چیز ہے اور اس کارفرمائی پر حالتوں سے بھی بدرجہا زیادہ مستحکم ایمان و یقین کی روح سے معمور ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔

مقام دعوت کے تقاضے

"الہلال" کے ابتدائی دور میں بعض احباب کو یہ احساس پیدا ہوا کہ مولانا کا لب و لہجہ ذرا سخت اور درشت ہے۔ ممکن ہے "الہلال" کی جلدوں کا مطالعہ کرتے وقت اب بھی بعض احباب کو یہ احساس پیدا ہو۔ اس غلط فہمی سے محفوظ رہنے کے لئے مولاناؒ کے مقام دعوت اور دور کے عام حالات کو پیش نظر رکھ لینا ضروری ہے۔ وہ آزادی اور حق پرستی کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ "الہلال" اس دعوت کا وسیلہ تھا۔ داعی کا مقام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ اپنی ہر بات کو عوام کے دلوں میں اتار دے۔ وہ صرف دماغوں کو اپیل نہیں کرتا بلکہ دماغوں سے کہیں بڑھ کر اس کی اپیل دلوں سے متعلق ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر بے حسی پائی جاتی تھی۔ ہر طرف جمود نظر آتا تھا۔ حکومت کا رعب دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ ذی وسائل اور ذی رتبہ افراد کے لئے ایک خاص احترام کی فضا موجود تھی۔ خواہ ان کا مسلک و مشرب راہ حق سے کتنا ہی ہٹا ہوا تھا۔ مولانا کے لئے ایک داعی حق کی حیثیت میں صورت حال کو منقلب کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسی ضرورت نے انہیں ایک ایسے لب و لہجہ پر مجبور کیا جو درشت نہیں البتہ حد درجہ بے باکانہ ضرور تھا۔ دعوت حق کو کامیاب بنانے کا احسن طریقہ یہی تھا کہ وہ نہایت ہراس انگیز اقدامات کو زیادہ سے زیادہ محبوب و دل پذیر بنا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں

نے نفع و سود کو ٹھکرایا اور نقصان و زیاں سے پیار کی دعوت دی۔ پھولوں کو پامال کیا اور کانٹوں سے محبت کرنے کی صدا بلند کی۔ اس وقت اہل ملک کو قربانی کے لئے تیار کرنا منظور تھا اور قربانی کی دعوت گل پاشیوں کے ذریعے سے کبھی پروان نہیں چڑھی۔

شانِ استقامت

مولانا کے ایمان و یقین کی طرح ان کی رائے کو بھی پختگی کا بلند ترین درجہ حاصل تھا۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے کب اپنے ذہن میں ایک مستقل نقشہ تیار کر لیا تھا۔ "الہلال" کے پہلے نمبر کے افتتاحیے میں ایک اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۰۵ء کے موسم سرما میں ان کی چشم بینا نے ایک خواب دیکھا تھا۔ دنیا کے سامنے ان کے نقشۂ عمل کے اجزا ۱۹۱۲ء میں آئے لیکن یہ پروگرام انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں تیار کیا تھا اور چوبیس سال کی عمر میں عمل شروع کیا۔ اس وقت سے آزادی حاصل کرنے تک پینتیس سال گزر گئے۔ سیکڑوں افکار کی راہیں ملیں۔ ان کے مسالک و مشارب میں تغیر پیدا ہوا لیکن مولانا نے جو راستہ ۱۹۱۲ء میں اختیار کیا تھا اس پر وہ برابر انتہائی دلجمعی سے قائم رہے۔ یہاں اس راستے پر موت کا کوئی سوال نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ وہ جہاں ایک مرتبہ چٹان کی طرح جم گئے وہاں سے ایک آنچ بھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ زندگی کی عزیز ترین متاع ہر دل عزیزی ہے جسے قربان کرنے کے لئے انسان بہ آسانی تیار نہیں ہوتا۔ یہ متاع عزیز اس جوانی کے ابتدائی مراحل ہی میں اس پیمانے پر مل گئی تھی جس کا ایک حصہ بھی اکثر اصحاب کے نزدیک سرمایۂ فخر بن کر حاصل حیات ہوتا ہے اور یہ ہر دل عزیزی ایسی نہ تھی جیسی سیاسی ہنگاموں کے دوران میں پھولوں کے ہاروں، جلوسوں اور نعروں کی شکل اختیار کر کے لیڈروں کے نذر ہوتی رہی۔ مولانا کی ہر دل عزیزی دلوں کی تڑپ کا جزو بن گئی تھی۔ یہ گراں بہا متاع انھوں نے اسی راستے کی پختگی اور اسی مسلک کی استقامت کے صدقے میں بے دریغ لٹا دی۔ اپنے علم و نظر کے مطابق حق کی خاطر اس سے بے نیاز ہو چلے، اس بے مثال ہمت اور اس بے دریغ قربانی کا نمونہ کہاں مل سکتا ہے!

علم و عمل کا تاجدار

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم و نظر میں تاجداری و سلطانی کا مرتبہ مل جاتا ہے۔ وہ عمل و عزیمت کے میدان میں کم ہی کوئی ممتاز درجہ حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے اور غور و فکر میں انہماک عموماً قوت عمل پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے تاجدار تھے۔ انھیں دونوں دائروں میں سلطانی کا تاج نصیب ہوا اور آج فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ علم میں بڑے تھے یا عمل میں، انھوں نے مدت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت دی اور یہ دعوت خوش نما الفاظ، دل نشیں تحریرات یا پُرتاثیر خطابات تک محدود نہ تھی بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی دعوت تھی جس کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی حرارت سے معمور تھا۔ انھوں نے جو اونچی سے اونچی بات کہی اس پر اونچے سے اونچے عمل کا نمونہ پیش کیا۔ ایسے یگانہ افراد ہر فضا میں تربیت نہیں پاتے اور ایسے گراں مایہ گوہر ہر خاک سے نہیں اٹھتے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے۔

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

مضمون بے قصد و ارادہ بہت لمبا ہو گیا۔ سچ ہے۔

ہمہ عشق است و رود حیلہ بجوید آں ورنہ
کہ از معنی یک حرف صد دفتر نہ ساند

استغنا اور بے نیازی

تاہم مولانا کی ایک نادر خصوصیت کا ذکر کئے بغیر اسے ختم نہیں کر سکتا۔ یہ ان کی شان بے نیازی تھی۔ "الہلال" کے دور اول ہی میں دنیا نے تسلیم کر لیا تھا کہ علم و فضل میں ایسا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا اور عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ ان سے وابستہ ہو گیا تھا۔ بارہا ان سے التجائیں کی گئیں کہ اپنے سوانح مرتب فرما دیجئے اور اپنے علوم و معارف کی مستقل حفاظت کا بندوبست کر دیجئے۔ انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ نیاز مندوں کی التجاؤں کو شرف پذیرائی بھی بخشا۔ پھر ہر سکیم، ہر منصوبہ اور ہر ارادہ ان کی بے نیازی کی نذر ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جاتے تو علوم و معارف کا ایک یگانہ حلقہ قائم کر سکتے تھے اور یہ حلقہ ان کی نگرانی میں علمی کارناموں کے ایسے انبار لگا سکتا تھا جن کی کوئی مثال اس وقت تک سامنے نہیں آئی اور خود ان کے معارف بھی بہترین طریق پر اشاعت پا سکتے تھے مگر انھوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ سب سے آخر میں رکھا۔ یہ استغنا

یہ بے نیازی تمام نیازمندوں کے لئے ہمیشہ رنج و قلق کا سامان بنی رہی۔ معلوم ہوتا ہے وہ طے کئے بیٹھے تھے کہ اگر انھوں نے علم و عمل کی کوئی قابلِ ذکر متاع چھوڑی ہے تو زمانہ خود اسے محفوظ کرے گا۔ اگرچہ اسے محفوظ کر دینے کا وقت کئی مدتوں کے بعد آئے گا اگر ایسی کوئی متاع نہیں چھوڑی تو پھر اس کی حفاظت میں چند لمحے بھی صرف کرنا قدرت کی عطا کی ہوئی مہلت کا ضیاع ہوگا۔

نذرِ حقیر

میں اپنے علم و نظر کی بے مائگی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بلند مرتبہ شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کا اہل نہ تھا۔ چند محسوسات و متاثرات تھے، جو بے اختیار زبانِ قلم پر آگئے۔ بے رنگ اور بے خوشبو پھول ہیں۔ جنھیں اسی محبت کے ساتھ مولانا کی بارگاہِ عظمت و جلال میں حاضر کرتا ہوں۔ ایک بے نوا فقیر سلطانِ علم و عمل کی قدم گاہ میں اور کیا نذر پیش کر سکتا ہے؟ خدا کرے یہ نذرِ حقیر شرفِ قبول سے محروم نہ رہے۔ اس ذکر کو مرزا غالب کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جس کی ردیف ضرورتاً بدل لی ہے۔

ہندوا رند صحن پیشہ گمے بود
اندریں دیرِ کہن میکدہ آشنائے بود

مرزا غالب ہندوستان کے یگانہ تاجدارِ سخن تھے مولانا علم و عمل دونوں کے یگانہ تاجدار تھے۔ مرزا بھی گمنام نہ تھے اور مولانا کے بارے میں بھی کسی کو گمنامی کا وسوسہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرزا نے اپنے مقام کی بلندی اور اس کے شایانِ شان قدر شناسی سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو گمنام کہنا پسند کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ بالکل یہی حالت مولانا کی سمجھئے۔

زمانہ جس طرح غیر معلوم ماضی سے گردش میں ہے۔ اسی طرح غیر معلوم مستقبل میں بھی گردش کرتا رہے گا۔ عام لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور بلند مرتبہ شخصیتوں کے ظہور کا دروازہ بھی بند نہ ہوگا۔ لیکن ہم جس دور سے جس عہد سے گزر رہے ہیں اسے مدِ نظر رکھتے ہوئے کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ مولانا کے پایہ کی یا ان سے ملتی جلتی شخصیت پھر پیدا ہوگی؟ اس کائنات کی کوئی بھی شے خدا کی دسترس سے باہر نہیں۔ بقا صرف اللہ کے لئے ہے۔

لعمرک اللہ

۱۳۷۷ھ

روحی الہ آبادی

قطعۂ تاریخِ وفاتِ حسرت آیات امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نور اللہ مرقدہٗ

اُٹھ گئے آزادِ ذی فضل و کمال — ہو گئی سنسان بزمِ سوز و ساز
ختم ناکام تماشائے جمال — گوش محرومِ صدائے دل نواز
چھپ گیا علم و ادب کا آفتاب — آگئی شامِ بلا محشر طراز
جنگِ آزادی کا وہ مردِ جری — سرزمینِ ہند کو تھا جس پہ ناز
تھا غریبوں کا انیس و غمگسار — دردمندانِ وطن کا چارہ ساز
تھا سراپا درد وہ عالی تبار — پیکرِ اخلاق تھا وہ پاکباز
اس کا دل تھا محرمِ رازِ حیات — دور بیں تھی اس کی چشمِ امتیاز
رحلتِ آزاد کی صبحِ ملال — لے کے آئی ہے شبِ ہجرِ دراز
اس کی فرقت میں ہیں آنکھیں خونچکاں — ہے زباں پر یہ دعائے دل گداز
وقفِ عشقِ جاوداں تھی اس کی روح — دے اسے جنت خدائے بے نیاز

یہ ہے روحی اس کی تاریخِ وفات
زیرِ تربت اب ہے محوِ خوابِ ناز

۱۹۵۸ء

سعید احمد اکبر آبادی

ترجمان القرآن

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں جس انشاء و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں، یوں تو وہ سب ہی سدابہار ہیں لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر "ترجمان القرآن" مولانا کی تمام علمی اور ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہادِ فکر، وسعتِ نظر و مطالعہ اور جذبۂ تحقیق و تدقیق، مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو اُن کی ہر علمی اور ادبی تحریر میں سطر سطر ہیں۔ لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اس بنا پر اردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

عربی، فارسی اور اردو میں سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن اُن کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں یا اس سے مستنبط احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اُن اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اربابِ علم ان سے استفادہ کریں تو کریں۔ لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو دل نشیں کر کے اس کا یقین پیدا کر دینا وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے۔ اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں اُن سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں تاویل و توجیہ کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت، اس کی جامعیت اور اس کی بے قید و بند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے۔ مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی عظمت کے شایانِ شان ہے۔ مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیبِ بیان، صحابۂ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب متعین کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں اضطراب و تشویش کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق و مطالب دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں بقول مولانا کے "وضعیت" پائی جاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہے اور عام انسانی افکار و خیالات پر اُن کی گرفت مضبوط ہوتی رہی قرآن کی تفسیر میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے رہے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی کی مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہا گیا کہ اس میں منطق، فلسفہ، حکمت، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثال مصر کے علامہ جوہر طنطاوی کی ضخیم تفسیر جواہر القرآن ہے جس نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذخیرہ بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ وضعیت یا صناعیت قرآن کی اُس سادگی اور فطریت کے بالکل خلاف ہے جو اس کی ہر ہر آیت میں نمایاں ہے۔ قرآن اگرچہ عقل کو نظر انداز نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقۂ استدلال وجدانی ہوتا ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کرتا ہے اور اسی وجدانیت کے ذریعہ ہدایت اور اصلاح کا وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے دنیا میں پیغمبر آتے رہے اور جس کے لئے خود قرآن کا نزول ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو اُس فطریت اور سادگی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

قرآن کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب جہاں کہیں آپ کو کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے سائنٹیفک طریقۂ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ذوالقرنین نامی جس شخصیت کا ذکر آیا ہے اُس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی ہے۔ لیکن مولانا نے ان تمام آراء کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد آثارِ قدیمہ کے انکشافات جدیدہ اور پھر خود قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد ایران کا عظیم المرتبت بادشاہ کیخسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مؤرخ کا رول ادا کیا ہے۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفہ کے طلبا اور علماء کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطرت اور سادگی اور اس کی دو جانبیت کے ساتھ فلسفہ و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ وضعیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہو جاتا ہے۔

ان چیزوں سے قطعِ نظر عام تفسیروں میں ایک نقص یہ ہے کہ اُن میں معمولی معمولی اور فروعی باتوں پر بہت زور دیا جاتا ہے لیکن جہاں تک قرآن کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا تعلق ہے جن کا رابطہ عام انسانی اجتماع و تمدن سے ہے اُن پر یا تو کلام ہی نہیں کیا جاتا۔ یا کلام کیا بھی تو محض سرسری اور ضمنی۔ جس سے قرآن کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کا خطاب ایک قوم یا ایک جماعت کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جاتا ہے مثلاً وحدتِ ادیان۔ اور دوسرے مذاہب اور ان کی الہامی کتابوں کی تصدیق۔ قرآن کی ایسی اہم اور بنیادی تعلیم ہے جس کو اس نے بار بار مختلف طریقوں سے بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن عام مفسرین نے اس پر زیادہ اعتنا نہیں کیا اور جہاں کہیں ایسی آیات آئی ہیں اُن پر سرسری طور سے گذر گئے ہیں متاخرین میں غالباً حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور دوسری کتابوں میں اس حقیقت کو زیادہ ابھارا اور اجاگر کیا ہے اور ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے اس بحث پر نہایت مدلل، واضح اور پُر زور کام کیا ہے اور اس سلسلے میں دین کی اصل حقیقت، عہد بعہد اس کا ارتقاء، شریعت و منہاج کا فرق، دین اور شریعت کا باہمی تعلق، دوسرے مذاہب، ان کے بانیوں اور ان کی

آسمانی کتابوں کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر اور اس سلسلے میں پیغمبرِ اسلام کی عام دعوت اور انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود کا اصل راز۔ ان تمام مباحث پر مولانا نے زورِ قلم کمالِ بلاغت اور وسعتِ فکر و نظر کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس بحث کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ قرآن اُس پروردگارِ عالم کا کلام ہے جس کی ربوبیت اور پروردگاری ہر انسان اور ہر شخص کے لئے ہے اور وہ کسی خاص ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں کو توڑنا چاہتا ہے نہ کہ ان میں اور اضافہ کرتا۔ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی طرف جو دعوت دیتا ہے وہ ایک ایسی ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو ہر مذہب کی بنیاد ہے اس لئے اس کا کام وصل کردن ہے نہ کہ فصل کردن۔

چنانچہ مولانا اسلام کے لفظ کی تشریح بھی اسی وحدتِ ادیان کی روشنی میں اس طرح کرتے ہیں۔

"اس نے (قرآن نے) دین کے لئے "الاسلام" کا لفظ اسی لئے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانونِ سعادت انسان کے لئے ٹھہرا دیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ کچھ انسان ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام کائناتِ ہستی اسی اصل پر قائم ہے سب کے بقا و قیام کے لئے خدا نے کوئی نہ کوئی قانونِ عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی روگردانی کریں کارخانۂ ہستی درہم برہم ہو جائے وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں"

(ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۰۸-۲۰۹)

مولانا نے اس بحث کے آخر میں ایک بڑا نکتہ پیدا کیا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں پڑتا کہ کہیں کسی اور جگہ میری نظر سے گذرا ہو۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خود سوال کرتے ہیں کہ۔

"جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو بُرا نہیں کہتا

سب کو سچا اور سب کی تصدیق کرتا ہے اور ہمیشہ ان ہی باتوں کی
تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں۔ کوئی اس سے
لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے
انکار ہو؟"

اس سوال کو قائم کرنے کے بعد خود ہی اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں:-

"اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی
کہ وہ (قرآن) انہیں جھٹلاتا کیوں ہے بلکہ اس لئے تھی کہ جھٹلاتا
کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ قرآن صرف اسی کو
سچا کہے باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب
کی تصدیق کرتا تھا اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو
سکتا تھا۔"

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذہنی پس منظر کیا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ ذہنی پس منظر خود بخود بن گیا یا اس کی تعمیر میں چند خارجی مؤثرات و عوامل کا دخل ہے؟ اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا شروع ایک ایسا دور ہے جس میں عالمِ اسلام نے فکری اور ذہنی طور پر ایک نئی کروٹ لی ہے اس کے اسباب سیاسی بھی ہیں اور علمی بھی۔ دنیا کے عام تمدنی حالات بھی ہیں اور علومِ جدیدہ کا ارتقا بھی! اسی نئی کروٹ کا نتیجہ تھا کہ مصر میں مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا پیدا ہوئے اور ہندوستان میں شبلی اور سرسید۔ مولانا ابوالکلام کی سوانح عمری سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مولانا میں خود اجتہادِ فکر کی کمی نہیں تھی اور دوسری جانب وہ سید رشید رضا اور سرسید احمد خاں دونوں کی تحریروں سے کافی متاثر تھے اور اُن کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سید رشید رضا کی تفسیر المنار اور مولانا کا ترجمان القرآن ایک ساتھ مطالعہ کرے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے دو دماغ ہیں جو دو مختلف زبانوں میں اظہارِ مطلب کر رہے ہیں۔

متوسطین میں مولانا، حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم سے کافی متاثر ہیں "الہلال" اور "البلاغ" کے زمانے میں مولانا کے قلم سے جو مذہبی تحریریں نکلیں ان میں یہ رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا کے خصوصِ بیان و انشا

اور قدرت و بلاغت کلام کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے خواہ کوئی فکر یا خیال کہیں سے لیا ہو لیکن اس کو اس بسط و تفصیل سے اور مدلل اسیر حاصل بیان کریں گے کہ اس فکر کے بانی اور موجد وہی نظر آئیں گے۔

شروع شروع میں جب مولانا کی کتاب "ترجمان القرآن" چھپ کر آئی تو جیسا کہ پہلے سے توقع تھی۔ جہاں عام طور پر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سراہا گیا مسلمانوں کے ایک طبقے میں اس پر سخت تنقید اور نکتہ چینی بھی ہوئی۔ جو لوگ چار پانچ صدیوں سے اجتہادِ فکر سے محروم ہو کر تقلیدِ محض اور جمود و بے حسی کی زندگی بسر کر رہے تھے اُن میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے مجتہد فکر کا پیدا ہو جانا اُن کے ہیجان کا باعث ہی ہو سکتا ہے چنانچہ ترجمان القرآن پر تنقیدیں ہوئیں اور بہت دنوں تک اخبارات اور رسائل میں یہ سلسلہ چلتا رہا اگر ان تمام تنقیدوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان تنقیدوں کا ماحصل صرف یہ دو چیزیں ملیں گی۔

۱۔ مولانا نے قرآنی حقائق کا بیان اور آیات کی تفاسیر میں بالکل قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے یعنی جہاں قرآن میں کوئی حقیقت مطلق ہے مولانا نے بھی اس کو اسی طرح بیان کیا ہے اور جو حقیقت مقید بیان کی گئی ہے مولانا نے بھی اس کی رعایت رکھی ہے اس اسلوب سے ان لوگوں کی تشفی تو ہو جاتی ہے جو قرآن کو فقہ و کلام کی فرقہ بندیوں سے بلند و بالا ہو کر پڑھتے ہیں لیکن جن دماغوں پر فقہی مکاتبِ خیال کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ اُن سے الگ ہو کر کسی بات کو سوچ ہی نہیں سکتے اُن کو یقیناً مولانا کے اسلوب و زاویۂ نظر سے اختلاف ہونا چاہیئے

۲۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے جس کی حدیث میں مذمت آئی ہے لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں تک مولانا کی تفسیر کے مآخذ کا سوال ہے اُن کی نسبت مولانا نے خود لکھ دیا ہے کہ:-

"پہلے اس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈو
پھر بعد کے مفسروں کی طرف رُخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو
صاف نظر آئے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح
تھا۔ بعد کی دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور اُلجھاؤ
پیدا ہو گئے"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل صحابہ و سلف کے ہاں ضرور موجود ہے اور محض ایجاد بندہ نہیں ہے۔ جہاں تک تفسیر بالرائے کا تعلق ہے خود مولانا اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

"مشکلوٰۃ نبوت کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندر غیبۃً صحابہ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں"

لیکن تفسیر بالرائے سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اس کو بھی مولانا کی زبان سے سن لیجئے تاکہ مولانا کا نقطۂ نظر سمجھنے میں کوئی شک باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:-

"تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہوتا جیسے قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کا حال یہ ہے کہ اول سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا۔ دراصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلح شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لئے نہ کی جائے کہ جو قرآن کہتا ہے بلکہ اس لئے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے، اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔"

اسی بنا پر مولانا کو متداول اور مروجہ تفسیروں سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ

"جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا۔ جو اقوال نقل کریں گے، ان میں بہتر قول موجود ہوگا۔ لیکن اس کو نظر انداز کر دیں گے۔"

مولانا کی مندرجہ بالا عبارتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں اور دوسرے مفسرین میں جو راہوں کا اختلاف ہے اس کا مبنیٰ کیا ہے؟ اسی بنا پر اگر بعض حلقوں میں مولانا کی تفسیر پر نکتہ چینی ہوئی تو وہ ہرگز خلاف توقع اور محل تعجب نہیں ہے۔

ترجمان القرآن قرآن مجید کی تفسیر بھی ہے اور ترجمہ بھی۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ تفسیر سے متعلق تھا۔ اب چند باتیں ترجمہ کی نسبت سن لیجئے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اصل زبان سے واقف نہیں ہیں وہ ترجمہ کے ذریعہ اس عبارت کا مفہوم و مطلب سمجھ جائیں۔ مگر عام طور پر قرآن کے جو تراجم اردو میں پائے جاتے ہیں اُن سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تراجم لفظی بلکہ تحت اللفظی ہیں اور ان سے مقصد اخذ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کے تراجم کے برخلاف مولوی نذیر احمد دہلوی نے ترجمہ قرآن میں دلی کی بولی ٹھولی کو اس درجہ دخل دیا کہ بعض مقامات پر قرآن کی سنجیدگی اور ثقاہت مجروح ہو گئی۔ لیکن مولانا نے نہ وہ راہ اختیار کی اور نہ یہ، بلکہ ایک طرف تو قرآن کی عظمت اور اس کی ثقاہت کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایسا کوئی لفظ نہیں آنے دیتے جو قرآن کے مرتبۂ ثقاہت سے فروتر ہو اور دوسری جانب ترجمہ کی ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ وہ اپنی وضاحت میں کسی کا محتاج نہیں۔ ایک عالم کی طرح ایک عام اردو خواں بھی اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ پھر مولانا نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا نوٹوں کا بھی اضافہ ہے۔ جن میں مطالب قرآن کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قرآن میں جو مطلب یا جو حکم مجمل تھا اس کی تفصیل لکھی ہے تاکہ قرآن کا اصل مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور جہاں جہاں قرآن کے کسی مطلب کو واضح کرنے کے لئے دلائل و شواہد کی ضرورت تھی وہاں دلائل و شواہد لکھے ہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ بجائے خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص تفسیر کا مطالعہ نہ بھی کرے تو نفس ترجمہ اور اس پر جو نوٹس ہیں ان کی مدد سے قرآن کے مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔

پھر ترجمہ اور تفسیر اور یہی نہیں بلکہ مولانا کے علم مذہبی مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت جس پر شاید عام لوگوں کی نظر نہیں ہے یہ ہے کہ ان سب میں مولانا کا اسلوب بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے۔ اس میں وعد بھی ہے اور وعید بھی تبشیر بھی ہے اور انذار بھی۔ کہیں وہ نسیم جاں فزا ہے اور کہیں برق خاطف۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا اثر ہوتا ہے اور قاری میں جذباتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا کا یہ طرز ادا، یہ اسلوب بیان ان کے ہر مذہبی مضمون میں نمایاں ہے لیکن جہاں تک خاص ترجمان القرآن کا تعلق ہے تو یہ شراب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئی ہے اور اسی لئے غالب کا یہ شعر اس پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

روشن صدیقی

امام الہند کی یاد میں

کون یہ آخرِ شب بزمِ سحر سے اُٹھا — نالۂ درد، دلِ اہلِ خبر سے اُٹھا

ہائے کس وقت بجھی شمعِ نہاں خانۂ عشق — شعلۂ غم نفسِ بادِ سحر سے اُٹھا

کون ہے محرمِ اسرارِ مشیت لیکن — اعتبار آج دعاؤں کا اثر سے اُٹھا

ہو گئے قافلۂ اشکِ رواں میں شامل — بارِ اندوہ نہ جب لعل و گہر سے اُٹھا

عظمتِ منبر و محراب جھکی جاتی ہے — کون خلوت کدۂ فکر و نظر سے اُٹھا

تا فلک سلسلۂ حزن و الم طاری ہے — جس طرف آنکھ اُٹھی درد اُدھر سے اُٹھا

سن لیا جب کہ جدائی ہے یہاں شرطِ وصال — حشر خود اشکِ بداماں ترے در سے اُٹھا

علم ہے شاہدِ پنہاں کا حجابِ اکبر — ہاں یہ پردہ بھی ترے حسنِ نظر سے اُٹھا

مہرِ خورشید نے آنکھوں سے لگایا اُس کو — کوئی ذرہ جو تری راہگذر سے اُٹھا

تو نے تمکینِ خرد، ذوقِ جنوں کو بخشی — ایک الزامِ کہن عشق کے سر سے اُٹھا

مرگ سے راز کھلا تیری دل آرائی کا
اک نیا دور ہے یہ تیری مسیحائی کا

حافظ علی بہادر خاں

مولانا آزاد کے فکر و نظر کی چند جھلکیاں

تحریکِ خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت حاصل ہوئی۔ اُن کی زندگی میں ایک عرصہ تک اُن کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کا موقع ملا اور بارہا اُن سے بحث و گفتگو کا بھی فخر حاصل رہا۔ ان ملاقاتوں اور مذاکروں میں یہ حقیقت مجھ پر ثابت ہو گئی کہ مولانا "حیات بعد الممات" کے فلسفہ کے قائل تھے۔ ایک مقالہ میں خود انھوں نے یہ الفاظ لکھے "درحقیقت یہ ایک قانونِ حیات بعد الممات ہے جو کائنات کی ہر شے پر طاری ہے۔" وہ اکثر قرآن کی یہ آیت پیش کیا کرتے تھے۔ یخرج الحیّ من المیت و یخرج المیت من الحیّ (وہ موت سے زیست اور زیست سے موت پیدا کرتا ہے)

اس فلسفہ کی روشنی میں یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ مولانا آزاد کی موت دراصل ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

وہ عموماً یہ آیت بھی استعمال کیا کرتے تھے الحمد للّٰہ الذی احیانا بعد ما اماتنا (سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں زندگی دی بعد اس کے کہ ہم مر چکے تھے)

اس لحاظ سے مولانا کی وفات کے بعد اگر ان کی زندگی کے حالات تحریر و تقریر میں اس طرح پیش ہوتے رہیں جو قوم میں نئی روح پیدا کریں تو ان کی وفات کے بعد بھی ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور خدمتِ خلق کا رول ادا کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہے جو مولانا ابوالکلام کے حالات بیان کرنے میں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا رہے ہیں اور فلسفیانہ انداز میں لطیف نکات پیش کر رہے ہیں لیکن اس مختصر مقالہ میں مجھے چند واقعات سادہ الفاظ میں بیان کرنے ہیں تاکہ خواص کے ساتھ عوام بھی ان سے سبق حاصل کر سکیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو" والی تحریک سے کچھ دنوں قبل کا واقعہ ہے جب کہ جاپانی فوجیں ہندوستان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں اور یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ اُن کی یلغار سے ہندوستان شاید ہی محفوظ رہ سکے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ارکان مع صدر کانگریس مولانا ابوالکلام جیل میں تھے۔ ایسے وقت گاندھی جی نے ایک اخباری بیان میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر جاپانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اُن کا مقابلہ بھی کانگریس عدم تشدد کے ساتھ کرے گی۔

اس وقت مولانا آزاد بھی سنٹرل جیل الہ آباد میں ایک مختصر سے یارڈ میں تھے جس میں صرف چار کوٹھریاں اور ایک برآمدہ تھا۔ ایک کوٹھری میں مولانا آزاد اور بقیہ تین میں ڈاکٹر کاٹجو، کیسو دیو مالویہ اور راقم الحروف رکھے گئے تھے جب گاندھی جی کا مذکورہ بالا اخباری بیان اخبارات میں آیا تو مولانا آزاد کا اضطراب قابلِ دید تھا وہ ہم سے بار بار کہتے تھے "مسٹر گاندھی! یہ تو کانگریس کی پالیسی ہے ہی نہیں۔ یہ گاندھی جی نے کیسے کہہ دیا۔ پھر فرماتے تھے کہ کانگریس نے تو جاپانیوں کے مقابلہ کے لئے عدم تشدد کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" مجھے مولانا کے وہ سب فقرے یاد نہیں جو وہ روانی میں ادا کر رہے تھے۔ مگر مطلب یہ تھا کہ کانگریس کے لئے عدم تشدد کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک پالیسی ہے جو اس نے برطانیہ کے اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے اختیار کر رکھی ہے ضروری نہیں کہ جاپانیوں کے معاملہ میں بھی عدم تشدد کا حربہ موثر سمجھا جائے۔

اتفاق سے میری اور مولانا کی کوٹھریوں کے درمیان ایک مستقل دروازہ کھلا تھا جس کے باعث ہر وقت ایک دوسرے کی حالت آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ جب مولانا ورانڈے میں غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد اپنی کوٹھری

میں داخل ہو سکے تو میں اپنی کوٹھری سے اُن کے اضطراب کا دل جیب نظارہ کر سکتا تھا۔ وہ کوٹھری میں سخت بے قرار تھے اور بار بار یہی کہتے کہ گاندھی جی نے یہ بالکل غلط بات کہہ دی "ایک بار اپنی کوٹھری سے مجھ کو مخاطب کرکے بولے گاندھی جی کی بھی عجیب حالت ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہی ہماری مشکلات کا باعث ہو جاتے ہیں اور پھر وہی ہماری مشکلات کا حل بھی ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد مولانا کی سیاسی زندگی کا ایک اور پہلو نظر آیا۔ انھوں نے کوشش کی کہ ایک تحریر جیل سے باہر بھجوائیں جو صرف خلاف قانون طریقوں سے جا سکتی تھی۔ اسی زمانہ میں دو کانگریسی کارکن ایک وکیل اور ایک اسکول ٹیچر جن کو سزا پا چکے تھے کہ انھوں نے جیل میں سیاسی لیڈروں کو خفیہ خطوط بھیجنے کی کوشش کی تھی اور مشہور یہ تھا کہ لیڈر بھی مولانا آزاد ہی تھے یہ مسئلہ اُس بار کے کانگریسی کارکنوں میں مختلف فیہ تھا کہ جیل میں جانے کے بعد جیل کے قانون اور ڈسپلن کی پابندی کی جائے یا نہیں۔ مولانا آزاد اُس گروپ میں سے تھے جن کے نزدیک خفیہ خطوط کی آمد و رفت اگر وہ انقلاب کے لئے ہو تو جائز ہے۔ چنانچہ جب میں رہا ہونے لگا تو مجھے بھی ایک خط خفیہ طریقہ سے باہر لے جانے کا حکم ہوا تھا مگر پھر مولانا کو اور کوئی آسان ذریعہ مل گیا اور میں اس خطرناک خدمت سے محروم رہا۔

بہرکیف جب مولانا اس فکر میں تھے کہ گاندھی جی تک اپنا پیام پہنچائیں اور اُن کی غلطی پر تنبیہ کریں کہ خبر ملی کہ گاندھی جی الٰہ آباد تشریف لا رہے ہیں جہاں کملا میموریل اسپتال کا افتتاح فرمائیں گے نیز مولانا سے ملاقات کے لئے جیل میں بھی آئیں گے۔

گاندھی جی اور مولانا کی یہ ملاقات جیل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں ہوئی تھی جہاں ہم میں سے کوئی موجود نہ تھا مگر گاندھی جی نے ملاقات کے بعد فوراً ہی ایک انٹرویو اخبارات کو دیا جس میں بتایا کہ پچھلے انٹرویو میں جاپانیوں کے مقابلہ میں عدم تشدد کا حربہ استعمال کرنے کا جو خیال میں نے ظاہر کیا تھا وہ میرا ذاتی عقیدہ تھا کانگریس کا عقیدہ نہیں تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اپنے فیصلہ کا اختیار ہے اور وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب دوسرے روز گاندھی جی کا یہ بیان میں نے پڑھا تو مولانا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے گاندھی جی سے یہ بیان دلوایا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں میں نے اُن کو توجہ دلائی تھی

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسٹر جناح کا یہ الزام کتنا غلط تھا کہ مولانا آزاد کانگریس کے یا ہندوؤں کے "شوبوائے" ہیں۔ ایک طرف تو گاندھی جی کی انصاف پسندی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف ثابت ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو کانگریس میں خاص اقتدار حاصل تھا اور وہ کانگریس کے منصب، وقار اور روایات کے زبردست محافظ تھے۔

نینی جیل کی زندگی میں مولانا نے چند لکچر بھی ہماری درخواست پر دیئے تھے۔ دوسرے بارڈوں سے بھی سیاسی قیدی ان میں شریک ہونے کے لئے آ جاتے تھے۔ بعض رفیقوں کے مشورہ پر میں نے ان لکچروں کی بنیاد پر ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا جس پر خود مولانا نے جگہ جگہ ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ ایک جگہ میں نے "اسلامی کلچر" کا جملہ استعمال کیا۔ بین السطور میں مولانا نے اپنے قلم سے لکھ دیا "بشرطیکہ اسلام جیسے عالمگیر مذہب کا کوئی کلچر ہو۔" اس پر میں نے جب مولانا سے گفتگو کی تو پایا کہ اُن کی رائے میں اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہے۔ مختلف ممالک کے لوگوں کے مختلف کلچر ہوتے ہیں اور مختلف زمانوں میں کلچر بدلتے رہتے ہیں مگر ان مختلف ممالک کے لوگوں اور مختلف زمانوں کے لئے اسلام ایک ہی رہتا ہے۔ لہذا اسلام کا کوئی مخصوص کلچر نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ کلچر ایسا لفظ ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی اور مختلف ملکوں میں مختلف مفکرین نے اس کا استعمال مختلف معنی میں کیا ہے۔

نینی جیل میں یہ عجیب بات میں نے پائی کہ مولانا صبح سے شام تک صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ صرف صبح کے چار بجے ترجمان القرآن کا فائل لے کر بیٹھتے اور اُس کے بعض مسائل پر غور کرتے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے مطالعہ میں والٹیر، روسو، نطشے، گوئٹے اور متعدد سیاسی لیڈروں کے سوانح حیات رہتے تھے۔ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن سے صرف بی۔ اے، ایم۔ اے کی قابلیت والے آدمی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ مولانا کی انگریزی کی قابلیت اتنی ہے کہ ایسی ادق کتابیں سمجھ سکیں۔ اپنا شک رفع کرنے کے لئے اُن کتابوں میں سے بعض کے مسائل پر میں نے مولانا سے سوالات کئے۔ مولانا نے جو جواب دیئے اُن سے معلوم ہوا کہ صرف انھوں نے وہ کتابیں پڑھی اور سمجھی ہیں بلکہ اُن مسائل سے متعلق دوسری بھی بہت سی انگریزی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ فہم مضامین کے اعتبار سے اُن کی قابلیت ایم۔ اے سے زیادہ تھی لیکن انگریزی میں گفتگو بالکل نہیں

کر سکتے تھے۔ ایک بار جیل میں انگریز حاکم (غالباً ڈپٹی کمشنر تھا) آگیا تھا۔ وہ مولانا سے انگریزی میں بات کرتا تھا تو مولانا سمجھ تو لیتے تھے مگر جواب اُردو میں ہی دیتے تھے۔ بعد میں مولانا نے انگریزی بولنے کی بھی کچھ مہارت پیدا کی تھی مگر اس قدر کہ بے تکلف بات چیت کر سکیں۔ میرا خیال ہے کہ مولانا کو انگریزی بولنے میں صرف اس لئے تکلف ہوتا تھا کہ تحریر و تقریر میں جو بلند معیار اُن کے پیش نظر رہتا تھا اُسے گفتگو میں قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسی لئے مولانا نے شاعری ترک کر دی تھی۔ وہ فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ وہ نہایت اچھے بھی ہوتے تھے لیکن مولانا کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ اس کا مطلب نہیں کہ جو اعلیٰ معیار مولانا نے قائم کیا تھا اُس کے مطابق وہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے لیکن ایسے شعر کہنے کے لئے جیسی فرصت درکار تھی وہ انہیں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ مجبوراً انہوں نے شعر گوئی کا شوق ترک کر دیا۔

شعر و شاعری کا ذکر آگیا تو ایک واقعہ اور بھی لکھ دوں۔ مولانا کی آنکھیں آشوب کر آئیں جس کے باعث اُن کا مطالعہ بند ہو گیا۔ معمول یہ تھا کہ میں اور وہ صبح چار بجے اُٹھتے۔ مولانا اپنے ہاتھ سے چائے تیار کرتے اور عصر کے لئے بچا ضرور رکھتے۔ وہ دو کپ چائے پی کر ہم الگ ہو جاتے اور اپنا اپنا مطالعہ شروع کر دیتے لیکن جب آنکھیں دُکھنے لگیں تو کبھی تو صبح تک باتوں میں گزر جاتی اور کبھی میں اپنی کوٹھری میں چلا آتا اور مولانا بیٹھے کچھ سوچتے یا عموماً اشعار پڑھتے رہتے۔ ایک روز چائے کے بعد جب میں اپنی کوٹھری میں آ کر مطالعہ میں مشغول ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا اپنی کوٹھری میں چہل قدمی کرتے جاتے ہیں، سگریٹ کے دھوئیں چھوڑتے جاتے ہیں اور میر کی غزل کا یہ شعر ہلکی آواز سے مزے مزے سے گنگناتے جاتے ہیں ؎

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

اوپر بتا چکا ہوں کہ دونوں کوٹھریوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ درمیان میں صحن در کھلا ہوا تھا اور مولانا کی ایکٹنگ کے لئے میں تماشائی تھا۔ مولانا کو ترنگ میں میر کی غزل پڑھتے دیکھا تو سوچا شاید مجھے دیکھ کر مولانا آزادی سے اپنے جذبات کا مظاہرہ نہ کر سکیں لہذا میں پلنگ پر لیٹ گیا گویا کہ سو رہا ہوں۔ مگر تقریباً ایک گھنٹے تک نیم باز آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتا رہا کہ مولانا ٹہلا کر غزل کے اشعار پڑھتے تھے اور جب مذکورہ بالا شعر پر آتے تو جھوم

اُس کی رٹ لگانے اور وجد میں آ جاتے۔ مقطع کو بھی بار بار دہراتے ؎

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مولانا کی آنکھیں کیا دُکھنے آئیں کہ میرا نصیب جاگ اٹھا کیونکہ صبح کا مطالعہ تو بند ہو گیا تھا مگر چائے کا دَور ضرور اپنے وقت پر چلتا تھا اُس کے بعد اکثر مولانا کی گل افشانی صبح تک جاری رہتی تھی۔ اگرچہ آج کل زبان میں گل افشانی کا محاورہ کبھی بُرے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر میں اصلی لغوی معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ علم و مطالعہ کے پھول جھڑتے تھے۔ کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے وسعتِ داماں بھی بخشتا۔ میرا جتنا بھی مل گیا اُس کے لئے شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اگر اس گفتگو کے جھگڑے کے مختلف پہلو لکھنے لگوں تو سو ڈیڑھ سو صفحات لکھنے کے بعد بھی یہی کہتا رہوں گا۔

م کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

جیل کی زندگی میں مولانا کے معرکے، لطیفے اور پند و نصائح سننے کے متعدد مواقع ملتے تھے۔ دو وقت کھانے کی میز پر، ایک وقت ناشتے کے ساتھ، اور ایک بار شام کو پانچ بجے کی چائے پر۔ علاوہ بریں جب اخبارات پڑھ چکے ہوتے تو اُس روز کی خبروں پر بھی رائے زنی ہوتی تھی۔ پھر شام کو ہم لوگ بیڈمنٹن کھیلتے اور مولانا کتاب لے کر برآمدے میں بیٹھتے اور کھلاڑیوں کو داد دیتے۔ کبھی شطرنج جم جاتی تھی۔ دو ایک شاطر دوسرے یارڈوں سے بھی آ جاتے تھے۔ مگر عموماً میں ایک طرف ہوتا اور سب مل کر مجھے مات دینے کی ناکام کوشش کرتے۔ میرے مقابلہ پر تو ڈاکٹر کاٹجو یا کرشن کانت مالویہ بیٹھتے تھے مگر چالیں بتانے میں مولانا بھی شریک ہوتے تھے۔ میں سب کو مات دیا کرتا تھا لیکن ایک روز مجھ سے ایسی غلطی چال میں ہو گئی کہ ڈاکٹر کاٹجو نے مات کر دیا۔ بس پھر کیا تھا مولانا نے بساط الٹ دی اور فرمایا کہ بس اب حافظ جی کو مات ہو گیا اب نہیں کھیلتے اور دوسرے یارڈوں میں بھی شاطروں کو خبر بھجوا دی کہ حافظ جی کو مات ہو گیا۔" جیل میں تاش بھی ہوتا تھا مگر مولانا اس میں کبھی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے چند الفاظ اُس بارک کے متعلق لکھ دینا ضروری ہیں جس میں مولانا کو قید کیا گیا تھا اور جہاں حسنِ اتفاق سے مجھے مولانا کی بات کی معیت نصیب ہو گئی تھی۔ یہی منزل

جیل الہ آباد کے مضافات میں بہت وسیع جیل ہے۔ اس کے اندرونی وسیع رقبہ کے ایک گوشہ میں چار کوٹھریوں کے گرد احاطہ کی دیوار بنا کر وہ مالک بھائی سے جس میں مولانا آزاد کو رکھا گیا تھا۔ اسے جیل کے قیدی "کُتا بارک" کہتے ہیں اس لئے کہ اس میں اُن قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن کو پیٹنے کا پروگرام ہوتا تھا۔ ان کوٹھریوں میں بند کر کے جب ان پر مار پڑتی تھی تو یہ کیسا ہی چیختے اور بھاگتے کتوں کی طرح چلاتے مگر دوسری بارکوں تک آواز نہ پہنچتی تھی اس لئے بارک کا نام "کُتا بارک" پڑ گیا تھا۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو کو گرفتار کیا گیا تو یہی چار کوٹھریاں رہیں کوئی گیٹس تاکہ وہ عام قیدیوں سے بالکل الگ رہ سکیں اور اُن پر سیاسی اثرات نہ پڑ سکیں۔ پنڈت موتی لال نہرو کے لئے انگریزی حکومت نے ایک ورانڈا اور بنوا دیا۔ میں جب پہنچا ہوں تو اس میں تین سیاسی قیدی تھے۔ ایک مسٹر کیشو دیو مالویہ، دوسرے بالکرشن شرما "نوین" اور تیسرے مسٹر پالیوال، یہ تینوں اُتر پردیش کے مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ میں اگرچہ بمبئی کا تھا مگر الہ آباد میں ایک تقریر کی تھی جس کے جرم میں وارنٹ بھیج کر حکومت نے بمبئی سے گرفتار کرا لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی رہا ہوتا گیا اور ڈاکٹر کاٹجو، آر۔ ایس پنڈت (وجے لکشمی کے سورگیہ شوہر) مولانا آزاد اور ڈاکٹر حسین ظہیر باری باری آتے گئے۔ مولانا کو پہلے تو ایک ہی کوٹھری ملی تھی لیکن بعد میں ہم لوگوں نے مولانا کی تکلیف کا خیال کر کے اُن کو دو کوٹھریاں دے دیں اور دو آدمی ایک میں ہو گئے۔ مولانا ایک کوٹھری بطور غسل خانہ استعمال کرنے لگے۔ ان کوٹھریوں کے رقبہ کا اندازہ یوں کیجئے کہ جس کوٹھی میں مولانا کا انتقال ہوا اُس کے ڈرائنگ روم میں نینی جیل والی چھ کوٹھریاں بن سکتی تھیں۔ اسی احاطہ کے اندر بیڈمنٹن کا کورٹ تھا۔ ہم سب اے کلاس قیدی تھے اس لئے جو کھانا جیل سے ملتا تھا اُس میں اپنے خرچ پر اضافہ بھی کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی پنڈت نہرو کے گھر سے (غالباً وجے لکشمی کی طرف سے) کوئی کھانے کی چیز آ جاتی تھی۔ مگر زیادہ تر وہیں کھانا تیار ہوتا تھا۔ احمد نگر کی اسیری کے دوران تیرا ایی کوٹھی پر مولانا معمولی چائے کی بجائے یاسمین سے شوق کرتے تھے مگر نینی سنٹرل جیل میں لپٹن یا بروک بانڈ ہی استعمال ہوتی تھی۔ کبھی اتفاق سے صبح چار بجے کی چائے کے وقت اگر رات کا دودھ خراب ہو گیا یا بلّی پی گئی تو پھر مولانا بغیر دودھ کی چائے کا سیٹ نکالتے تھے۔

بمبئی میں آغا حشر کشمیری مشہور ڈراما نگسٹ تھے جو مولانا کے ساتھ تھے مجمل اور حالات کے مولانا آزاد کے اشعار بھی سُنے تھے۔ ان میں سے دو ایک شعر مجھے یاد تھے۔ یہی جیل میں میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آیا یہ اشعار اُن کے ہی ہیں اور آغا حشر کی بدمستیں کی۔ مولانا یہ کہتے ہوئے اپنی کوٹھری میں چلے گئے کہ "عہد جاہلیت کی باتوں سے کیا فائدہ؟" ان میں سے دو شعر یہ ہیں ؎

وعدۂ وصل ہی اک طرز تماشہ کی ہے بات   میں تو بھولوں نہ کبھی اُن کو کبھی یاد نہ ہو
آ تا دب خودی کے سبب راز دیکھ   پوچھی رہیں گی تو کبھی آسمان کی

مولانا کبھی کبھی بمبئی بھی رہے ہیں مگر اُن کی سرگرمیاں زیادہ تر کلکتہ ہی میں محدود رہیں۔ بمبئی میں پربل روڈ پر اُن کے والد کے نام سے ابھی تک مسجد خیر الدین موجود ہے۔ ایک بار تحریک خلافت کے زمانہ میں منبر پر کھڑے ہو کر میں نے سیاسی تقریر کی تو مجھے سیٹھ عبدالرحمٰن قدرت والا مرحوم نے بتایا کہ اسی منبر پر مولانا آزاد کے والد اپنا خطبہ اس مصرعہ سے شروع کیا کرتے تھے۔

۲ سب کا خدا ہے میرا خدا محمدؐ

اس مصرعہ میں مذہبی عقائد کا جو تصور ہے اُس کے خلاف مولانا آزاد نے جس طرح بغاوت کی اُس کا تذکرہ مولانا ملیح آبادی کی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" میں نہایت دلچسپ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ باپ اور بیٹے کے عقائد میں بُعد المشرقین بہت ہی عجیب ہے لیکن اس سے یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے کہ مولانا آزاد بالکل "وہابی" ہو گئے تھے۔ اُن کی وسیع النظری کا تجربہ مجھے کئی اہم مواقع پر ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں جب میں روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر تھا تو میں نے اُس میں تصاویر کی اشاعت شروع کی۔ اس پر مولویوں نے بہت مخالفت کی کیونکہ اُن کے نزدیک فوٹو کی اشاعت حرام تھی۔ مولانا یہ سلسلہ "الہلال" میں شروع کر چکے تھے میں نے اُن سے اخلاقی امداد طلب کی۔ مولانا نے کوئی اعلان تو نہیں دیا۔ مگر پرائیویٹ طریقہ سے بعض سرکردہ مخالفین کو سمجھا دیا اور مجھے چند ایسے مشورے دیئے جو بہت مفید ثابت ہوئے۔ مثلاً یہ کہ پہلے ناظم مصر یا قائدین ترکی کے فوٹو شائع کرو جب لوگ عادی ہو جائیں تو آگے قدم بڑھانا۔ اس طرح روزنامہ "خلافت" میں فوٹو چھپنے کا رواج ہو گیا۔

دوسرا واقعہ اُن کی وسعت نظری کا یہ ہے کہ جب کمال اتاترک نے خلافت کو ختم کر کے جمہوریت قائم کی تو مولانا نے اس خیال کی تائید کی کہ ایک جمہوری کونسل بھی خلیفہ کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔ خلیفہ کی علاحدگی پر اُن کے اور علی برادران کے درمیان نہایت ناخوشگوار مباحثہ بھی ہوا مگر مولانا نے ایک سلسلۂ مضامین میں کمال اتاترک کے طریق کار کی حمایت کی۔

مسلمانوں میں جس قسم کا پردہ رائج ہے مولانا اُسے غلط سمجھتے تھے۔ جیل میں اس مسئلہ پر کافی گفتگو ہو چکی تھی لیکن جیل سے باہر بھی ایک بار جب میرے دوست خلیل تبرف اپنی ہمشیرہ کے مولانا کی ملاقات کو گئے تو اُن کی ہمشیر کا صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے تھے۔ مولانا نے فرمایا اسلام کا منشا اسی قسم کا پردہ ہے۔

مولانا کا تعلق اسلام کے کسی فرقہ سے نہیں تھا وہ اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے اور ہر مسئلہ پر اسلام کی تعلیمات کی روح و منشاء کی روشنی میں نظر ڈالتے تھے حال میں کتاب "آزاد کی کہانی" کے بعض ابواب سے شیعہ فرقہ کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ مولانا اُن کے خلاف تھے لیکن یہی جیل میں ایک واقعہ پیش آیا جو اس غلط فہمی کو دُور کر سکتا ہے۔ جب ہم جیل میں تھے تو لکھنؤ میں مدح صحابہ کا قضیہ چل رہا تھا۔ میرے اخبار روزنامہ "ہلال" میں ایک مقالہ مدح صحابہ کی تائید میں شائع ہوا تھا۔ یہ پرچہ جب جیل میں آیا تو ڈاکٹر کاٹجو نے اس مقالہ میں دل چسپی لی کیونکہ جب وہ یو۔پی میں وزیر قانون تھے تو انھوں نے مدح صحابہ کے حق میں رائے دی تھی۔ ڈاکٹر کاٹجو کو یہ موقع اُس وقت ملا تھا جب کانگریس نے صوبائی خود مختاری کے دَور میں وزارتیں بنائی تھیں۔ مولانا آزاد مدح صحابہ کی تحریک کے خلاف تھے۔ اور اس بارے میں جمعیۃ علماء اور مجلس احرار دونوں سے اُن کو اختلاف تھا۔ ڈاکٹر کاٹجو نے روزنامہ "ہلال" کا وہ پرچہ مولانا کو دکھایا۔ مولانا مجھ پر خفا ہوئے کہ تمہارے اخبار میں ایسے مقالات کیوں چھپتے ہیں۔ ڈاکٹر حسن ظہیر بھی اس وقت جیل میں تھے میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں تو مدتوں سے اسی دور آپ کے پاس ہوں مجھ پر "ہلال" کے مقالات کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو سکتی۔ بہرکیف مولانا نے مجھ سے ایک خط میٹی لکھوا دیا جس میں ادارۂ "ہلال" کو ایسے مقالات شائع کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا کے سامنے کسی وقت بھی کسی خاص فرقہ کی مخالفت یا موافقت کا سوال نہیں تھا وہ ہر معاملہ پر اُس کے حسن و قبح کے لحاظ سے نظر ڈالتے اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر بلا خوف و استقلال اُس پر قائم رہتے تھے۔

میرے نزدیک مولانا آزاد کی تحریک کانگریس سے پہلے کا سب سے اہم واقعہ ۱۹۳۱ء میں پیش آیا جب کہ وہ یونیورسٹی لاؤڈ نیشنل کمیٹی کے جلسہ منعقدہ لکھنؤ میں مولانا محمد علی کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ذاتی تجربات کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس اختلاف کے نتائج کا اثر مولانا کی تمام زندگی پر پڑا۔ "الہلال" میں اس اختلاف پر مولانا نے نہایت رنگین سلسلۂ مضامین "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے لکھا۔ جواب میں علی برادران نے مولانا کے مقابلہ میں محاذ قائم کیا بدقسمتی سے چار برس روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر رہنے کے باعث میرا دامن مولانا شوکت علی صاحب کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا۔ عقائد مولانا آزاد سے ملتے تھے مگر زندگی مخالف کیمپ میں گذرتی تھی۔ میں نے یہ پایا کہ گو مولانا آزاد نے محض قابلیت کے زور سے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اپنا ایک بلند مقام بنا لیا مگر بڑی حد تک اُن کو عام پلیٹ فارم چھوڑ دینا پڑا۔ بہت لوگوں کو یہ شکایت رہی کہ ہندوستان کے اعلیٰ ترین خطیب ہوتے ہوئے بھی مولانا بہت کم عوامی پلیٹ فارم پر آکر تقریر کرتے ہیں۔ لیکن اصلی سبب یہ تھا کہ پلیٹ فارم پر علی برادران کا قبضہ تھا جو مولانا کو پلیٹ فارم سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا نے بھی اس کا احساس کیا اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے "سحاب پارٹی" بنائی۔ دراصل مجلس احرار کی تنظیم میں بھی مولانا آزاد کا اشارہ شامل تھا مگر مجلس احرار بہت جلد ایسی راہوں پر پڑ گئی جو مولانا کو پسند نہیں تھیں۔ یہی جیل میں سحاب کے بعض لیڈر مولانا سے ملنے آئے اور اس سے انٹرویو کے بعد انھوں نے مجلس احرار سے علیحدگی کا اعلان کیا مثلاً جناب داؤد غزنوی صاحب نے ہمیشہ کے لئے مجلس احرار کو یہی جیل کی ملاقات کے بعد ہی چھوڑا ہے۔ پلان یہ تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، محمد داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دیگر بعض اکابر اجتماعی طور سے مجلس احرار سے الگ ہو کر صرف کانگریس میں شریک رہیں مگر پلان پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔

بہرکیف علی برادران اور اُن کے ساتھی غلط یہ الزام لگاتے تھے کہ مولانا

آزاد نے پنجابی ٹولی کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم اس پنجابی ٹولی کے لیڈر قرار دیئے جاتے تھے۔

علی برادران اور مولانا آزاد کی کشمکش کا اثر یہ ہوا کہ مولانا آزاد کی اُن تقریروں سے دنیا محروم ہو گئی جو "الہلال" والی آن بان میں ہوتی تھیں اور جنھوں نے اُن کو "ابوالکلام" بنایا تھا۔ کانگریس کے مشترکہ پلیٹ فارم پر انھوں نے سادہ اُردو بلکہ ہندوستانی میں اظہارِ خیالات شروع کر دیا جس میں مغز ضرور ہوتا تھا مگر وہ جادو نہیں ہوتا جو سامعین کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔

مولانا کی زندگی اور اُن کی تحریروں پر ایک نظر ڈالنے سے مجھ پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ کانگریس میں شامل ہونے سے تقریباً دس برس پہلے سے وہ کانگریس کے رجحانات کو پسند کرتے تھے۔ مثلاً ۲۰ فروری ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں مسلمانوں کی نئی بیداری پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا:

"مسلمانوں میں نئی تحریک کی تاریخ تقسیم بنگال کی منسوخی سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے صرف حال حال اشخاص تھے جن کو کانگریسی، باغی، بے وفائے قوم، مفسد اور اسی طرح بعض بعض اصطلاحات خاص سے یاد کیا جاتا تھا۔"

اس اقتباس میں غور کیجئے کہ "کانگریسی" کا استعمال کس پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ یہ ۱۹۱۳ء کی تحریر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس میں شرکت سے بہت پہلے اُن کے رجحانات کانگریسی تھے۔

جیل میں مذہبی مسائل پر مولانا سے اکثر گفتگو ہو جاتی تھی مگر یہاں اُس کا تذکرہ مناسب نہیں ہوگا۔ لیکن ایک ادبی مسئلہ کی طرف اشارہ کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گزشتہ عید کو جب میں ملاقات کے لئے گیا تو موقع پا کر ایک سوال کر بیٹھا جس کا جواب تو انھوں نے دیا مگر ادھورا کیونکہ دوسرے لوگ آ گئے۔ سوال اس بارے میں تھا کہ جناب غلام رسول مہر نے جو کتاب غالب پر لکھی ہے اُس میں غالب کے گھر کو قمار خانہ اور غالب کا جواریوں سے مال وصول کرنا ثابت کرنے کے لئے مولانا آزاد کی سند پیش کی ہے اور مولانا آزاد نے نواب لوہارو کی شہادت پر بھروسہ کر کے غلام رسول مہر کو اس بارے میں تحریر دی ہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ نواب لوہارو کی شہادت قابلِ اعتبار نہیں بلکہ Tainted (مجروح) ہے کیونکہ غالب کی گرفتاری کے بعد خاندان لوہارو نے ایک مسجد جوادی کے ساتھ اپنے ہر تعلق سے بیزاری کا اعلان کر دیا تھا۔ حالانکہ خاندان لوہارو سے غالب کے تعلقات کا سب کو علم ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس اعلانِ بیزاری کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اُس خاندان کے ایک فرد نے مولانا کے سامنے غالب کے متعلق ایسا بیان دیا ہو۔

مولانا نے جواب کا آغاز اس طرح کیا تھا کہ غالب کا خرچ بہت تھا اور آمدنی کم تھی اس لئے انھوں نے اپنے گھر شہر کے جواریوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ آمدنی کا سلسلہ قایم رہے۔ ایسے حالات میں خاندان لوہارو کے ایک ذمہ دار آدمی کی شہادت کافی ہے۔ حصور صاحب کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہ بولیں گے۔ ابھی مولانا سمجھا ہی رہے تھے کہ چند آدمی آ گئے۔ اور تھوڑے انتظار کے بعد مجھے رخصت ہو جانا پڑا۔ مگر مولانا کے جواب سے مجھے ذرا بھی تشفی نہ ہوئی۔

میں نے مولانا کے سامنے ایک اور وقت مرزا ابوالفضل کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودوں کے بارے میں بھی چند گزارشات پیش کی تھیں اور مولانا نے ضروری کارروائی کرنے کا وعدہ بھی فرمایا تھا میں نے منٹی کے متعلق حضرات مثلاً عبدالحلیم صاحب (مالک مرقاۃ الدین الکتبی۔ اواب) کو یہ خوشخبری بھی پہنچا دی تھی۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس اہم کام میں مولانا نے کیا اقدام کئے۔

مولانا کی زندگی کے سب واقعات جو میرے تجربہ میں آئے ایک مقالہ میں نہیں سما سکتے اس لئے یہاں بس کرتا ہوں ؎

تو مپندار کہ ایں قصہ بخود می گویم گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

شمیم کرہانی

خضرِ حیات

ٹوٹا ہے آج خاکِ وطن پر وہ کوہِ غم
پربت کا دل اداس ہے گنگا کی آنکھ نم
یکجا ہیں سوگوار صنم خانہ و حرم
غم سے جبیں پہ پرچمِ ہندوستاں ہے خم
مشرق کی صبحِ نو کا اُجالا چلا گیا
فرزندِ ارجمند ہمالا چلا گیا

وہ اُٹھ گیا، وطن کو ملا جس سے اپنا رنگ
جس نے حیاتِ عصر کو بخشی نئی اُمنگ
دل جس کا کوہِ ہند تھا، خوں جس کا موجِ گنگ
دانش سے جس کی ٹوٹ گئے جادوئے فرنگ
خضرِ حیات و رہبرِ بیدار چل دیا
ہندوستاں کا قافلہ سالار چل دیا

جس نے جنوں کو عام کیا وہ ابوالکلام
جس نے خرد کا کام کیا وہ ابوالکلام
مغرب کو جس نے رام کیا وہ ابوالکلام
مشرق کا جس نے نام کیا وہ ابوالکلام
ہر نا امید دل کو جو امید دے گیا
شامِ وطن کے ہاتھ میں خورشید دے گیا

دانش میں طاق، فن میں یگانہ تھی جس کی ذات
اک روزگارِ نو کا ترانہ تھی جس کی ذات
عہد آفریں جنوں کا فسانہ تھی جس کی ذات
دنیا تھی جس کی ذات، زمانہ تھی جس کی ذات
بے تاب ایک دل میں جہاں کی حیات تھی
ذاتِ ابوالکلام تھی یا کائنات تھی

پرسانِ حال، شامِ غریباں کے واسطے
افسانہ گو، بہارِ حبیباں کے واسطے
افسوں طراز، بزمِ خطیباں کے واسطے
سالارِ کاروانِ ادیباں کے واسطے

یکتا علوم و فن میں، یگانہ ثبات میں
شعلہ جہادِ زیست میں، شبنم صفات میں

دانش میں اس کی جوت تھی نورِ منیر
ظلمت پہ جا چمکتا تھا، تخیل کرن کے تیر
حسنِ سخن گلال تھا، رنگِ سخن عبیر
تیشے سے کوہکن کے اُبلتی تھی جوئے شیر

فن کے نئے نقوش جو ایجاد کر گیا
وہ بیستونِ فکر کا فرہاد مر گیا

مسند نشیں، مجاہد، باطل شکار بھی
دنیائے انقلاب کا پروردگار بھی
قرآن کا مفسر، حکمت شعار بھی
نقاد بھی، مصنف جادو نگار بھی

اتنے تضاد اور اک انساں کی ذات میں
ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں کائنات میں

دل میں عمل کا جذبۂ محکم لیے ہوئے
آنکھوں میں درد و سوز کی شبنم لیے ہوئے
ہمراہ، انقلاب کا عالم لیے ہوئے
ہاتھوں میں الہلال کا پرچم لیے ہوئے

جس رخ گیا، حیات کو بیدار کر دیا
ظلمت کدے کو مطلعِ انوار کر دیا

ذوقِ نظر، لطافتِ فکر سے دوچند تھا
لہجہ نبات و شہد، سخن تیز و تند تھا
رتبے میں مہر و ماہ سے بھی کچھ بلند تھا
لیکن عجیب مردِ حقیقت پسند تھا

دیتا نہ تھا گماں کو بڑائی یقین پر
تاروں پہ بھی نگاہ، قدم تھے زمین پر

اس کی نوا میں غنچۂ خنداں کی شگفتگی
شامِ نشاط و صبحِ بہاراں کی نغمگی
صحنِ چمن کی جوئے خراماں کی اُمگی
روحِ جنوں کے جذبۂ پنہاں کی تشنگی

وہ نغمگی کہ بانگِ درا جس کا نام تھا
جس کی تپش سے قافلہ مست خرام تھا

آواز کی تھی گونج کہ بادل کی تھی گرج
ہر سانس اک جہاد تھی ہر گام ایک حج
کیا زندگی کی شان تھی، کیا بانکپن کی دھج
رہتی تھی سیلے کی جبیں پہ کلاہ کج

مردِ فقیر، شوکتِ شاہانہ لے گیا
صحرا میں قیس رنگ تھا، دیوانہ لے گیا

بے شیشہ و جام تھی گو زندگی کی رات
سینے میں سوزِ داستاں تھی مگر مشعلِ حیات
فکر و نظر کے نور سے روشن تھے شش جہات
چلتا تھا ساتھ ساتھ جہانِ تجلیات

نقشِ قدم تھے مہر کا پرتو لیے ہوئے
اک صبح کا مؤذن تھی نئی صبح لیے ہوئے

وہ عہدِ طوق و دار، وہ ہنگامِ قید و بند
وہ حریت کا شور، وہ زنداں کا زہر خند
وہ سر فنا پہ دام، وہ ہر زیست پر کمند
لیکن مقامِ دار سے گزرا وہ سربلند
ہمت جو اُس کی ہمدم و دمساز ہو گئی
اک سر خمیدہ قوم سرافراز ہو گئی

کیا دورِ اضطراب تھا، کیا گردشِ مدام
زنداں میں اک قدم تو بیاباں میں ایک گام
بچپن حصولِ ہوش و خرد میں ہوا تمام
گزری جنوں میں عہدِ جوانی کی صبح و شام
وصلِ شباب، تیشہ زنی میں گزر گئی
پیری تمام کوہ کنی میں گزر گئی

ہر راستے میں سنگ، ہر اک رہگزر میں خار
اپنوں کا وہ سلوک کہ دشمن ہوں شرمسار
ملت کے اس عناد کے باوصف زینہار
خاطر کے آئینے پہ نہ پایا گیا غبار
تھی کون سی وہ بات جو درخورِ محن نہ تھی
لیکن جبینِ عزم پہ کوئی شکن نہ تھی

ملت کے طعن و طنز سے دم بھر نہ تھا فراغ
ہر لمحہ ایک زخم تو ہر لحظہ ایک داغ
پھر بھی نہ دل تھکا نہ فسردہ ہوا دماغ
موجِ ہوائے تند سے لڑتا رہا چراغ
آندھی کبھی کبھی جو بلا خیز ہو گئی
کچھ اور بھی چراغ کی لو تیز ہو گئی

تازہ نہیں یہ شیوۂ ابنائے روزگار
اکثر کہا گیا ہے زمانے میں گُل کو خار
گم ہو گئی ہے شور میں ہادی کی ہر پکار
حق گو کو دی گئی ہے سزائے صلیب و دار
"گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود"

"منصور" جو صفوں کو گزر گیا ہراسِ دار
ہوتے ہیں شاد دیکھ کے میدانِ کارزار
دائم کفن بدوش رہا مردِ جاں نثار
محفل میں جب گیا تو غزل خوان و نغمہ بار
ہر دم یہ دُھن کہ دشت کوئی پُر خطر ملے
کم اپنے روزگار میں شوریدہ سر ملے

ہمت قوی، دماغ توانا، نظر بلند
دل حسین، عزم جواں، رہگزر بلند
یوں کر گیا وطن کو نشانِ دگر بلند
ہندو ہے سرفراز، مسلماں ہے سربلند
"بے رستم اب جہان میں بے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا"

منزل سے آہ چھوٹ گیا ایسا راہبر
جس کی حیات آگ تھی، جس کا لہو شرر
جس کے نقوشِ پا سے چراغاں تھی رہگزر
غمگیں ہیں جس کے سوگ میں صحرا و دشت و در
محزون فضائے ہند ہے اور گرد یاس ہے
"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

ترجمانِ حالِ شامِ غریباں کے واسطے
افسانہ گو، جہانِ جدیداں کے واسطے
افسوں طراز، بزمِ خطیباں کے واسطے
سالارِ کاروانِ ادیباں کے واسطے
یکتا علوم و فن میں، نگارِ ثبات میں
شعلہ جہادِ زیست میں، شبنم صفات میں

دانش میں اس کی جذب تھا نورِ مہر
ظلمت میں جھلکتا تھا، مثل کرن کے تیز
حسنِ سخن کمال تھا، رنگِ سخن عبیر
تیشے سے کوہکن کے ابلتی تھی جوئے شیر
فن کے نئے نقوش جو ایجاد کر گیا
وہ بیستونِ فکر کا فرہاد مر گیا

مسند نشیں، مجاہد، باطل شکار بھی
دنیائے انقلاب کا پروردگار بھی
قرآن کا مفسر، حکمت شعار بھی
نقاد بھی، مصنف جادو نگار بھی
اتنے لطف و ادراک انساں کی ذات میں
ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں کائنات میں

دل میں عمل کا جذبۂ محکم لئے ہوئے
آنکھوں میں درد و غم کی شبنم لئے ہوئے
ہمراہ انقلاب کا عالم لئے ہوئے
ہاتھوں میں استقلال کا پرچم لئے ہوئے
جس رخ گیا، حیات کو بیدار کر دیا
ظلمت کدے کو مطلعِ انوار کر دیا

ذوقِ نظر، لطافتِ گل سے دوچند تھا
لہجہ نبات و شہد، سخن شیر و قند تھا
رتبے میں مہر و ماہ سے بھی کچھ بلند تھا
لیکن عجیب مردِ حقیقت پسند تھا
دیتا نہ تھا گماں کو بڑائی یقیں پر
تاروں پہ تھی نگاہ قدم تھے زمین پر

اس کی نوا میں غنچۂ خنداں کی نغمگی
شامِ نشاط و صبحِ بہاراں کی نغمگی
صحنِ چمن کی جوئے خراماں کی نغمگی
رقصِ جنوں کے خنجرِ عریاں کی نغمگی
وہ نغمگی کہ بانگِ درا جس کا نام تھا
جس کی تپش سے قافلہ تیز خرام تھا

آواز کی تھی گونج کہ بادل کی تھی گرج
ہر سانس اک جہاد تھی ہر گام ایک حج
کیا زندگی کی شان تھی، کیا بانکپن کی دھج
رہتی تھی سیپلے کی جبیں پر کلاہ کج
مردِ فقیر، شوکتِ شاہانہ لے گیا
صحرا میں جتنا رنگ تھا دیوانہ لے گیا

بے شیشہ و جرعہ تھی گو زندگی کی رات
سینے میں ضو فشاں تھی مگر مشعلِ حیات
فکر و نظر کے نور سے روشن تھے شش جہات
چلتا تھا ساتھ ساتھ جہانِ تجلیات
نقشِ قدم تھے مہر کا پرتو لئے ہوئے
اک صبح کا مزاج تھی ہر ضو لئے ہوئے

وہ عہدِ طوق و دار، وہ ہنگامِ قید و بند
وہ حریت کا شور، وہ زنداں کا زہرخند
وہ ہر فضا پہ دام، وہ ہر زیست پر کمند
لیکن مقامِ دار سے گزرا وہ سربلند
ہمت جو اُس کی ہمدم و دمساز ہو گئی
اک سرخمیدہ قوم سرافراز ہو گئی

کیا دورِ اضطراب تھا، کیا گردشِ مدام
زنداں میں اک قدم تو بیاباں میں ایک گام
بچپن حصولِ ہوش و خرد میں ہوا تمام
گزری جنوں میں عہدِ جوانی کی صبح و شام
فصلِ شباب تشنہ لبی میں گزر گئی
پیری تمام کوہ کنی میں گزر گئی

ہر راستے میں سنگ، ہر اک رہگزر میں خار
اپنوں کا وہ سلوک کہ دشمن ہو شرمسار
ملت کے اس عناد کے باوصف زینہار
خاطر کے آئینے پہ نہ پایا گیا غبار
تھی کون سی وہ بات جو دل میں چبھی نہ تھی
لیکن جبینِ عزم پہ کوئی شکن نہ تھی

ملت کے طعن و طنز سے دم بھر نہ تھا فراغ
ہر لمحہ ایک زخم تو ہر لحظہ ایک داغ
پھر بھی نہ دل تھکا نہ فسردہ ہوا دماغ
موجِ ہوائے تند سے لڑتا رہا چراغ
آندھی کبھی کبھی جو بلاخیز ہو گئی
کچھ اور بھی چراغ کی لَو تیز ہو گئی

تازہ نہیں یہ شیوۂ ابنائے روزگار
اکثر کہا گیا ہے زمانے میں گُل کو خار
گم ہو گئی ہے شور میں ہادی کی ہر پکار
حق گو کو دی گئی ہے سزائے صلیب و دار
"گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود"

"منصور حوصلوں" کو مگر کیا ہراسِ دار
ہوتے ہیں شاد دیکھ کے میدانِ کارزار
دائم کمینِ دشمن رہا مردِ جاں نثار
مقتل میں جب گیا تو غزل خوان و نغمہ بار
ہر دم یہ دُھن کہ دشت کوئی پُرخطر ملے
کم ایسے رہگزار میں شوریدہ سر ملے

ہمت قوی، دماغ توانا، نظر بلند
منزل حسین، عزم جواں، رہگزر بلند
یوں کر گیا وطن کو نشانِ دگر بلند
ہندو ہے سرفراز، مسلماں ہے سربلند
"بے رستم اب جہاں میں نہ سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا"

منزل سے آہ چھوٹ گیا ایسا راہبر
جس کی حیات آگ تھی، جس کا لہو شرر
جس کے نقوشِ پا سے چراغاں تھی رہگزر
غمگیں ہیں جس کے صدمۂ ہجراں سے دشت و در
محزوں فضائے ہند ہے اور گرد یاس ہے
"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

محمد یونس خالدی

امام الہند مولانا آزادؒ — سفر اور مقصدِ سفر

"۱۹۲۰ء میں جب کہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آیندہ زندگی کے لئے ایک "مذہب عمل" قرار دے لوں، جو صرف ملک و ملت وقت کا پیدا کردہ ہو، اس کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے، عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانش مند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے۔ اس طوفانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رخ، اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے۔"

(مسئلہ خلافت اور جزیرۂ عرب)

پھر یہ بھی یاد رہے کہ

"سفر دو ہیں، ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا، اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کئے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کر دیں۔ جب انھوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تو ان کا سفر مقصود تک پہنچ گیا، اور وہ کامیاب ہو گئے۔ اب ان کے لئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں، اس سفر میں سفر سے نہ رکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے، اور جس کے جس ساتھ نے اس مقصود کو پا لیا اس نے اپنا کام پورا کر دیا، یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں، ایک ہی ہے۔"

(تبرکات، مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۴۴)

باقی رہا مقصد کا سفر، تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے، لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے جو چلتا ہے۔ خدا کا کام ہے جو سورج کا تا اور بدلیاں بھیجتا ہے۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہرواں مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔"

(ترانہ مضامین)

جب یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں مذہب عمل کا تعین کس طرح کیا جائے اور کیا کیا جائے۔ لیکن جس کی زبان قلم سے یہ صدا بلند ہو رہی تھی۔ اس نے کہا کہ میرا مذہب عمل "ملک کی آزادی یا موت ہے۔" اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ آواز ہندوستان میں پہلی آواز تھی، اس لئے حیرت و استعجاب کے ساتھ سنی گئی، ہر سننے والے نے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ جو 'مذہب عمل' متعین کیا گیا ہے۔ اور اشخاص کے سفر کی جو منزل بتلائی جا رہی ہے کیا واقعی کسی شخص واحد کا مذہب ہو سکتا ہے اور کیا کوئی شخص اس راہ پر چل سکتا ہے؟

مگر جواب دے تو کون دے!

آخرکار وہی انسان آگے بڑھتا ہے اور پورے جلال کے ساتھ ہندوستان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

"میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں" (مسئلہ خلافت)

"ملک کی آزادی یا موت" یہ راگنی ہے وقت کی راگنی

ہے ، بلکہ اس کے لئے بیار نہیں ۔"

یہ آواز کسی ایک فرد کی آواز نہ تھی ہر شخص کی زبان پر یہی الفاظ جاری تھے۔ عوام سے شکوہ کیا جائے تو کس طرح کیا جائے مدبرین عصر کی زبانوں پر یہی کلمات تھے۔ ان حالات میں "مرد کار" آگے بڑھتا ہے، اور مدبرین زمانہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

> "ہمارے زمانے کے اکثر مدبر اس امر کو ایک مسلم الثبوت مسئلے کی حیثیت سے پیش کر دیا کرتے ہیں کہ کسی قوم کے لئے اس وقت تک آزاد ہونا مناسب نہیں جب تک وہ اپنی حریت کے صحیح استعمال کے لائق نہ ہو جائے۔
>
> یہ قول اس احمق کی زبان سے زیادہ موزوں معلوم ہوگا جو ایک یونانی روایت کے مطابق تیرنا سیکھے بغیر پانی میں قدم نہیں رکھنا چاہتا۔ پس اگر قوم حریت (آزادی) کے لئے اتنے دنوں تک انتظار کرے کہ بحالت غلامی ہی وہ پوری عاقل اور دور اندیش بن جائے، تو اس کو نا صرف انتظار ہی کھینچنا پڑے گا، وہ دریا میں اترنے کے لئے تیراکی کے سیکھنے کا انتظار کرے گی اور تیراکی بغیر دریا میں اترے تا قیامت نہ آئے گی۔"

(انتخاب البلاغ ص ۱۵)

لیکن مدبرین زمانے اس کا کوئی اثر نہیں لیا بلکہ کہنا شروع کر دیا کہ ایک آزادی کی جنگ کے نتائج آج تک بھگت رہے ہیں، اب جو جنگ لڑی جائے گی وہ ہم کو کہیں کا نہیں رکھے گی ہم کسی نئے انقلاب کے لئے تیار نہیں یہ غلامی ایک نعمت ہے اس میں ہم کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ دنیا میں جو انقلاب آتا ہے وہ تباہیوں اور بربادیوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ یہ آوازیں اس کے کانوں تک پہنچیں۔ ایک اضطراب کی چیخ بلند ہوئی۔ اس نے کہا۔

> "گو اکثر انقلاب کی ابتدا نہایت خراب دیکھی جاتی ہے مگر قوم جب تک آزادانہ زندگی بسر نہ کرے وہ آزادی کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہو سکتی" (انتخاب البلاغ ص ۱۲)

اس کی یہ دلیل ایک معقول دلیل تھی۔ مخالفت کرنے والوں نے سوچنا شروع کر دیا، شاید بہت جلد وہ وقت آ جاتا کہ پورا ملک اس کا ہمنوا بن جاتا کہ ملک کے قلب سے کہا کہ اس دور میں آزادی کا نام لینا اپنے کو مجرم بنوانا ہے۔ ہندوستان طاقت ور ظالمانہ اقتدار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں وہ مجرم بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

لیکن "آزادی یا موت" کا متوالا جو شخصی سوراج اور "مذہب عمل" کی حقیقت انسانی ماغوں سے منوانے کے لئے بے چین تھا، وہ بول اٹھا۔

> "ہر قوم کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے۔ جب اس کا ہر فرد حکومت کے نزدیک مجرم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ غلامی کے جرم سے توبہ کر لیتی ہے اور حق و آزادی کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ قوم کی آزادی کے یہی معنی ہیں کہ غیروں کی حکومت کا خاتمہ ہو ایسی ظاہر ہے کہ اجنبی حکمرانوں کے نزدیک جرم اور بغاوت کی اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔
>
> ہندوستان بھی آزادی کے لئے بے قرار ہے اس لئے کب کا مجرم ہو چکا ہے۔" (مضامین ابوالکلام آزاد ص ۱۹۲)

مگر اس کی باتوں پر جس طرح دھیان دیا جانا چاہئے تھا۔ اس طرح دھیان نہیں دیا گیا، اور کسی اس جنتی کو برابر کرکے "کا مرید نما ہمدردوں" نے کہنا شروع کر دیا کہ انگریزی حکومت اور اس کی برکات کا مقابلہ دوسرے آزاد ملکوں سے کرو، اور دیکھو کہ یہاں کی غلامی دنیا کی آزادی سے کس قدر بلند ہے۔ تعلیمی، سماجی، اصلاحی ادارے قائم کرنے کا ہم کو اختیار حاصل ہے۔ مندر، مسجد، گرجے، گردوارے آزاد ہیں۔ حکومت ہر گوشۂ حیات میں ہماری مدد کر رہی ہے۔ اس سے بڑی آزادی اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ تقریر بڑی خوش نما تقریر تھی اور دلائل بھی ناقابل تردید دلائل تھے لیکن جس طبیب حاذق نے نبض پر ہاتھ رکھنے سے پہلے چہرے سے مرض کو بھانپ لیا ہو۔ اس کے سامنے ان دلائل کی کوئی قیمت نہیں۔ اس نے کہا کہ۔

> "ایک حکومت ایک قوم کی حریت و آزادی سلب کر لیتی ہے۔ اس سے غلاموں کی طرح کام لیتی ہے اس کی قوت کو فنا کر دیتی ہے اس کی اخلاقی حالت برباد کر دیتی ہے۔ اس کا یہ عمل باطل ایک قلم سرچشمہ فساد ہے۔

لیکن وہ کہتی ہے کہ میں اپنی قوم کی اصلاح کر رہی ہوں، اور اسی کی اصلاح و عروج کے لئے دوسری قوم کو اپنا غلام بنا رہی ہوں۔

پس جو شخص اس حکومت کے خلاف جہاد کرتا ہے، اس کو مفسد قرار دیتی ہے۔" (مضامین البلاغ)

لیکن

> "میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گڑھی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لئے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ دیئے جائیں۔ لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے، پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا، اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں"

(قول فیصل " بیان عدالت)

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی کی جنگ لڑے تو کون لڑے اس ملک میں متعدد قومیں ہیں، لیکن یہاں کے عوام دو اکثریتوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک کا نام ہندو ہے اور ایک کا نام مسلمان، دونوں کی تہذیب دونوں کی معاشرت میں شدید اختلاف ہے اور یہ اختلاف ہر گوشۂ حیات میں ظاہر ہے۔ اس لئے دونوں مل کر آزادی کی جدوجہد میں کیسے حصہ لے سکتے ہیں؟

یہ سوال ایک ایسا سوال تھا کہ جس نے اس پیکرِ عزیمت کو ایک لمحہ کے لئے غور و فکر میں ڈال دیا۔ اس نے اپنی رہنمائی کا ہاتھ جس رہنما کے ہاتھ میں دیا تھا۔ اس کی تعلیم سے رہنمائی کی۔ تفصیلی جواب سے قبل اس نے پرجوش لب و لہجہ میں کہا کہ

> "ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے۔ صداقت و حق پرستی کے بہترین فرائض ادا کرنے کے لئے، ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور ان کی یک جہتی ضروری ہے۔" (خطبہ صدارت آگرہ)

اس اجمالی جواب نے مخالفین میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دی۔ اور اس جھنجھلاہٹ کے پیش نظر ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا، کہ یہ نعرہ مذہب کے خلاف ہے، کفر و اسلام کا اتحاد قیامت تک ناممکن ہے۔ اور دنیا کا کوئی بڑا سے بڑا انسان مذہبی تعلیم کی روشنی میں اس کو ثابت نہیں کر سکتا۔ یہ آواز صرف مسلم لیگ پلیٹ فارم کی آواز نہ تھی، بلکہ کچھ خانقاہوں سے بھی اسی قسم کی صدائیں بلند ہوئیں، منبروں، محرابوں، سجادوں اور دستاروں سے آواز میں آواز ملائی گئی۔ کتابچے شائع ہونے شروع ہوئے۔ اور مخالفین کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کا جواب ناممکن ہے۔ لیکن وہ پیکرِ حریت و آزادی آگے بڑھا، اور ہندوستان کے ۹ کروڑ انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ۔

> "ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ہندوستان کے ۲۲ کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں
>
> آپ میں سے اپنے مسلمان بھائیوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان تھی۔ اس وجودِ مقدس نے عہد نامہ لکھا تھا، یہ اس کے الفاظ ہیں کہ
>
> "ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن ہونا چاہتے ہیں، ایک قوم بنا چاہتے ہیں۔" (خطبہ صدارت آگرہ)

پھر اس سلسلے میں دلائل کا ایک انبار سامنے آیا۔ اس نے مخالفین کو ایک زبردست شکست دی۔ مگر نوجوانوں میں "آزادی" کے جذبات پرورش پاتے دکھلائی دیئے۔ یہ بات ہندوستانی روایات کے خلاف تھی۔ اس لئے اس نے کہا کہ میری ۱۹۲۱ء کی بات کو یاد کرو، اور اس کو اس مرکز آزادی میں اصل الاصول کی حیثیت دے لو۔ میں نے کہا تھا کہ

> "ہر طاقت ور ہاتھ جس میں تلوار ہو، اپنے مخالف کو شکست دے سکتا ہے، لیکن تحسین اس فاتح کے لئے ہے جو اسلحہ کے استعمال کے بغیر حریف کو اپنے قابو میں کر لے۔" (الندوہ لکھنؤ اپریل ۱۹۲۱ء)

یہ بات بظاہر بڑی خوش آئند بات تھی مگر جس فصیح انداز میں کہی گئی تھی۔ عوام اس کے متحمل نہ تھے، مردِ آزاد نے ان کے چہروں کو پڑھا اور کہنا شروع کیا کہ۔

ہندوستان کی قومیت بحث و نظر کے ابتدائی دور
سے گزر کے عمل و سعی کی منزل میں پہنچ چکی ہے۔ اس لئے قدرتی بات
ہے کہ آپ کے ذوقِ عمل پر بحث و نظر کی طوالت گراں گزرتی ہو
اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی بلکہ عمل کی سادگی
ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اور یہ حقیقت بھی تھی لوگ عمل کے لئے بے چین تھے۔ پہلا عملی پروگرام "ترکِ موالات" اور ولائتی مال کے بائیکاٹ کے نام سے سامنے آیا۔ مگر ترکِ موالات (نان کوآپریشن) ایک ایسا مسئلہ تھا جو بہتوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ کیا ترکِ موالات سے ملک آزاد ہو سکتا ہے کیا اس طرح غلامی سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا کسی ملک نے نان کوآپریشن سے نجات حاصل کی ہے؟ بظاہر یہ باتیں ایسی تھیں جو عوام کو متاثر کرنے والی تھیں، حالانکہ اعتراض کرنے والوں کے دل جانتے تھے اور ان کو اس کے دوررس نتائج کا بھی اندازہ تھا پھر بھی ان زبانوں پر مہرِ سکوت لگانا ضروری تھا۔ اس لئے معلمِ آزادی نے صاحبانِ فہم و فراست کی زبان میں فرمایا کہ

"قوموں کی سیاسی جدوجہد کے میدان میں دیکھا جائے
تب بھی یہ نہ صرف ایک صحیح اعتقاد ہے۔ بلکہ صحیح عمل ہے۔ یہ
بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آزادانہ
حقوق کوآپریشن کے ذریعہ نہیں حاصل کر سکی۔ ہر قوم نے اپنے
حقوق جدوجہد کر کے حاصل کئے ہیں اور جدوجہد مقابلہ اور
کشمکش ہے۔ کوآپریشن نہیں۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اب مسئلہ کی صحیح صورت نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ اور ملک کے ہندو مسلمانوں نے مل کر جدوجہد شروع کر دی۔ عدم تعاون (نان کوآپریشن) اور ولائتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک شباب پر آئی۔ برطانوی سامراج کے قدم ڈگمگانے لگے۔ سب سے پہلے نئے نئے ہتھکنڈوں کی تلاش شروع ہوئی۔ ملک میں کچھ طاقتیں اور افراد پہلے سے موجود ہی تھے جو موقع کے منتظر تھے۔ ہر ایک نے ایک نیا گل کھلایا۔ جس نے سرے سے اس تحریک کو عمل باطل قرار دیا۔ ہندو مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج حائل کر دی اور شدھی، سنگٹھن کے نام سے ملک میں تصادم کرانا اصول قرار پایا جس کے بعد دوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ ہر شخص نئے نئے بہروپ بھرنے لگے اور وہ آزادی کی جنگ جو کامیابی سے ہم کنار ہونے والی تھی، وہ بظاہر رک گئی تھی لیکن یہ بات ملک کے لئے اور اہلِ ملک کے لئے بڑی شرمناک بات تھی۔ اس لئے اس نے ہندوستان کے ہر باشندے کو اس کا کیا ہوا عہد یاد دلایا، اور اس عہد کو یاد دلاتے ہوئے کہا کہ:-

"چار سال ہوئے کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک
بڑے سے بڑا اعلان کیا، اور دنیا سے کہا کہ ہماری آزادی کا
انتظار کرے لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی داستان
سننے کے لئے گوش بر آواز ہے، ہم آمادہ ہو گئے ہیں کہ اپنی علانیہ شرمناکی
اور اپنے ہولناک نمونۂ کشت و خون کی اس کے لئے نمائشی ترتیب دیں۔ موجودہ صورت
یہ ہے کہ سوراج اور خلافت کی جگہ شدھی کی تحریک اس کی مدافعت اور
سنگٹھن کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

اسی جانب میں

"ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے
بچاؤ اور دوسری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندوؤں
کے شر سے حفاظت کرو، جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی
تکرار ہو رہی ہے تو یہ سمجھ کہ یہ نقشہ ہندوستان کا
کب قائم رہ سکتا ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی، انگریزی سامراج کا منشا پورا ہوتے نظر آیا۔ علاحدگی پسندی کے خیالات کی لہر سے ملک میں اشاعت ہونے لگی مسلمان جن کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم تھی، اور جو علم اور دولت میں ان سے بہت پیچھے تھے، خود کو گھاٹے اور خسارے میں سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے دریافت کیا کہ کہئے اب کیا راستہ ہے۔ اس نے کہا کہ

"کسی قوم کے آزاد ہونے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ
اس کو آزادی کا پورا پورا احساس شامل کر دے۔ جس وقت
ہندوستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ترکی اور عرب کی آزادی محفوظ
رہنی چاہئے تو ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ خود آزادی
سے محروم نہیں رہ سکتا۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

یہ تو مسلمانوں کے لئے درسِ حقیقت تھا۔ اور ان کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا تھا مگر ساتھ ہی ہندوستان کی ۲۲ کروڑ آبادی سے بھی خطاب

گرفتہ ہوئے، اس مردِ حق بیں کو کہنا پڑا، کہ

"میں نے ۱۹۱۲ء میں اپنے ہم مذہبوں کے مسلک کے خلاف اپنی صدا بلند کی تھی۔ اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہارِ حق سے نہ روک سکا تھا ٹھیک اسی طرح آج میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صدا بلند کروں، جو ہندو سنگٹھن کی تحریک کے علمبردار ہیں۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے فرمایا کہ

"آج یہ تحریک ان لوگوں کو سنگٹھت کرنا چاہتی ہے جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے میں بلا کسی تامل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج بھی ہندوستان میں نہ کسی ہندو سنگٹھن کی ضرورت ہے اور نہ مسلم سنگٹھن کی ہمیں صرف ایک سنگٹھن کی ضرورت ہے اور وہ ہے "انڈین نیشنل کانگریس" ہے۔" (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

ابھی یہ کلمات اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ قیامت آگئی،

"مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کا سامان پہلے فراہم کیا جا چکا تھا۔ اب ہندو بھی برگشتہ ہونے شروع ہو گئے مسلمان کو ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کھائے جا رہا تھا، اور ہندو خلافت کی تحریک سے پیدا ہونے والے اثرات سے پریشان تھے۔ ان کو یہ خیال تھا کہ انگریز اگر اس وقت چلا گیا تو ملک کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے گی۔ بساطِ سیاست کے شاطر کھلاڑیوں نے دو قوموں کے دلوں میں دو الگ الگ قسم کے شبہات پیدا کر دیئے تھے ہندوؤں سے جس حد تک بات کہنی چاہیئے تھی، اس حد تک کہی گئی، رہا مسلمانوں کا سوال تو وہ اس کے ہم قوم تھے، ان سے اس طفلِ جرأت اور مجاہدِ جلیل کے تخاطب کا انداز دوسرا تھا۔ ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کوئی نیا نہیں تھا۔ جب اس نے ۱۹۱۲ء میں ملک کی آزادی کے لئے ہندو مسلم یک جہتی بھائی چارہ اور اتحاد کا درس دیا تھا اس وقت بھی ہندو اکثریت کا سوال اس کے سامنے مسلمانوں کی طرف سے رکھا گیا، مگر اس کی نگاہیں ماضی کے آئینہ میں حال کو دیکھتے ہوئے مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے اس کو کہنا پڑا کہ۔

"میں تو سمجھتا تھا کہ اب یہ بن نکل گیا، مگر آپ تیس برس کا پڑھا سبق ابھی بھولے نہیں، بیشک مسلمانوں کی تعداد کم ہے لیکن

گورنمنٹ ہندو گورنمنٹ ہو جائے گی، ہندو مسلمانوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔ پس مسلمانوں کو ہمیشہ غلام اور مملوک بن کر رہنا چاہیئے اگر یہ فلسفہ اب تک باقی ہے تو باقی رہے، ہم کو غلامی مرغوب ہے تو انشاء اللہ خدا ہمیشہ غلام نہ رکھے گا۔"

(مضامین ابوالکلام آزاد حصہ دوم، ایک مراسلے کا جواب)

مسلمانوں کو آزادی کی حقیقت سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ۔

"ہندوستان کو آزاد ہونا ہے وہ آزاد ہو کر رہے گا مورخینِ عالم کی صف ایک نئے مورخ کی راہ تک رہی ہے۔ وہ آزادیٔ ہند کا مورخ ہوگا خلافت کمیٹیاں اگر پوچھتی ہیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو آزادیٔ ہند کی تاریخ کا پورا مواد صرف اپنے ہی سرمایہ سے فراہم کر دینا چاہیئے۔ تاکہ جب مورخ کا قلم اٹھے تو اُسے اعتراف کرنا پڑے کہ ہندوستان اپنی آزادی کے لئے کسی جماعت کا اس قدر مرہونِ منت نہیں ہے جس قدر پیروانِ اسلام کا"

(تازہ مضامین ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء)

اور جس وقت یہ باتیں کہی گئیں اس وقت کچھ حالات بھی ایسے ہی پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے ہندوؤں کا اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لینا قرینِ قیاس تھا۔ کہ انگریز اگر گیا تو ملک کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ انگریزی سامراج کے ایجنٹوں نے اس شک کو یقین کا درجہ دینے کے لئے مسلمانوں سے مصالحت کی گفتگو شروع کی اور مسلمانوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان میں مصالحت کی پیش کش کا خیر مقدم کرنا چاہا مگر جس کی نظر بساطِ عالم پر تھی اور جو یہ شعبدہ اور یہ بات کہنے کے لئے تیاریاں کر رہا تھا اس نے کہا کہ۔

"جس وقت تک ایک چپہ زمین پر، ایک انچ زمین پر اتنے حصہ پر کہ جتنے حصے میں عراق کے گرد و غبار کا ایک ذرہ آسکتا ہے، اگر انگریزی حکومت کا بلاواسطہ یا بالواسطہ ہاتھ باقی رہے تو مسلمان کے لئے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کر لیں، پہاڑوں کے غاروں اور کھٹوں میں چلے جائیں وہاں درندوں کے ساتھ صلح کر لیں۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے ساتھ صلح کا ہاتھ بڑھائیں" (خطبہ صدارت جمعیت علماء لاہور ۱۹۲۱ء)

مگر جب یہ مرد باد دار سے دیکھا کہ میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو تھوڑی سی تبدیلی میں جاتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ

"ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے، اور ہو جانا چاہیئے کہ جب تک انگریزی گورنمنٹ، برٹش گورنمنٹ اپنے اس [illegible] گھمنڈ سے باز نہ آجائے، مسلمانوں کے خلاف ترکی کو برباد کردے، عراق کی سرزمین اس کی مداخلت سے پاک نہ ہوجائے، جب تک [illegible] کو جاہ میں اس کی کوئی طاقت غالب نہ کرے، قسطنطنیہ سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھا لی جائیں، ہندوستان کو آزادی نہ دی جائے اس وقت تک برٹش گورنمنٹ سے جنگ جاری ہے، اس وقت تک اس کے لئے جائز نہیں کہ صلح صفائی کا ہاتھ انگریزوں کی طرف بڑھا سکے۔ وہ تمہارے ان آبادیوں کو چھوڑ دے، جنگلوں میں چلا جائے، وہاں سانپوں کے ساتھ صلح کرلے، بھیڑیوں کے ساتھ صلح کرلے، مگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ صلح نہیں کرسکتا۔" (خطبۂ صدارت جلسہ آگرہ ۱۹۲۱ء)

لیکن جو تخم فساد فرقہ واریت کے نام سے بویا جاچکا تھا۔ اور جس کی آبیاری کے لئے دونوں کے خون بہائے جاچکے تھے۔ اب ایک تناور درخت بنتے ہوئے نظر آیا، دوسری طرف ملک کے بعض گوشوں سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ انگریز ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے تیار ہے مگر یہ ہندو مسلم اتحاد کا راگ گانے والے آزادی کی راہ میں روڑے بنے ہوئے ہیں۔ آج اگر ہندوستان اس مطالبہ سے دست بردار ہوجائے تو کل اس کو آزادی مل سکتی ہے۔ وہ عمر بھر اتحاد کے حامی ان صوبائی بھائی پر فریب باتوں کو سنا، اور پھر اس وقت کے ۴۰ کروڑ ہندوستانی انسانوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کردے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہوجائے۔

تو میں سوراج سے دست بردار ہوجاؤں گا مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔" (خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء)

لیکن بات جو ہونے والی تھی وہ ہو کر رہی، ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوا، فسادات کی لہریں تیزی کے ساتھ بڑھیں، اور ملک پھر غلام کا غلام رہا، مگر اس کے اٹھے ہوئے قدم پیچھے کی جانب نہ مڑ سکے۔ یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے برس اور گذار دیئے۔ یہ زمانہ خاموشی کے ساتھ گذارا جا سکا۔ جو تحریک شروع ہوئی [illegible] تک وہی پوری داستان دہرائی گئی [illegible] سے [illegible] تک، عدم تعاون، مالی کاٹ کی جنگ بہادری کے ساتھ لڑی گئی۔ آئینی تبدیلی کے آثار ۱۹۳۵ء سے آنے شروع ہوئے۔ اور اب ہندوستان کے نوڈی سیاست کے ماہرین نے بھی کہہ دیا کہ حکومت کی چولیں ڈھیلی ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اس مبصر اعظم کو ایک بار پھر پورے ہندوستان کو مخاطب کرنے کا موقع ملا۔ اور اس نے کہنا شروع کیا کہ

"اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں، ہمارا سفر دور کا تھا۔ اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گذرے، ہم ہر منزل پر ٹھہرے، لگ رکے کہیں نہیں، ہم نے ہر منزل کو دیکھا بھالا، مگر دل اس سے لگا نہیں سکے، ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے مگر ہمیشہ ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا، ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا، ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقت ور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے نہ چل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور دھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ ۱۹۲۳ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے، مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اٹھائیے اور سامنے کی طرف دیکھئے، نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا ہے بلکہ منزل بھی دور نہیں۔" (خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

مگر جہاں تک اندرونی ملکی مسائل کا تعلق تھا، تو اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح الجھے ہوئے تھے، اور سب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلمانوں کی علاحدہ پسندی

کہ منتشر تھا اور مسلمان اپنے کو اقلیت میں سمجھنے لگا تھا۔ اقلیت کو جن خدشات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ سارے خدشات ایک ایک کرکے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں اس کے بعض رہنماؤں نے اپنی علاحدہ پسندی کا عام طور پر اعلان بھی کر دیا تھا۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ جس نے ہندوستان کو متحدہ وحدت کا درس دیا ہو، اور جو باہمی اختلاف کو عالم انسانیت کا نقصان سمجھتا ہو، اس کے دل پر کیا گزری ہوگی جب ہوا کہ ان حالات سے اس کا سکون دل چھن گیا، اور ایک بار حکیمانہ انداز میں پورے ہندوستان کو اکثریت اور اقلیت کی حصوں میں سمجھا ہوئے مسلمانوں کے دلی خدشات کو دور کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا، اور اسی جذبہ کے پیش نظر حکیم ملت، امام الہند نے سب سے پہلے ایک سوال کیا کہ

"کیا ہندوستان میں مسلمان کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور وہ تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے۔ جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں۔"

لیکن اس سوال کا جواب کون دیتا، جب اس نے دیکھا کہ سب کی زبانوں پر مہر سکوت لگ چکی ہے، جواب دینا درکنار، سوال کے سمجھنے کی بھی صلاحیت نظر نہیں آئی تو وہ خود آگے بڑھا اور کہنا شروع کیا،

"ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں کہی گئی جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمان کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی ہے۔ اور اس لئے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہئے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی، دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونس) مسٹر آکلینڈ کالون کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہئے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین پر وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس سے درخت پھول پھل پیدا کئے وہ گو پچاس برس گزر چکے ہیں، مگر ابھی تک اس کی جڑیں خشک نہیں ہوئیں۔

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے خائف ہونا چاہئے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تقرر کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد کے ساتھ نوعیت کا سوال بھی کام کر رہا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں، ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے دوسرے کی دو کروڑ ہے اب اگرچہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہوگا، اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اسی نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کرکے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کرلیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کرلیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔"

(خطبۂ صدارت کانگریس ۱۹۴۰ء)

لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کو شک کا مریض بنا دیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی پشتوں پر کھڑے ہو کر اپنی لیڈری کی عمارت تعمیر کرنے والوں نے اس مرد حق آگاہ سے عام مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے گانٹھے اور یہ یقین دلانا شروع کیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے علاحدہ پسندی کی پالیسی صحیح پالیسی ہے، برطانوی سامراج کو اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے کا اس سے اچھا کیا وقت تھا۔ اس نے اس لئے بھی ۱۹۴۷ء میں انڈیا پلان کا اعلان کیا

"انڈیا پلان کی تقسیم ایک طرح کی تقسیم ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہونے تقسیم کے بعد جو حالات رونما ہوئے اس کا تصور بھی اندوہناک تصور ہے۔ اس وقت یہ یقین تھا کہ

"ملک کے بٹنے کی بنا پر سے ہندوستان کا نقصان تھا لیکن اتحاد کے رخصت ہو جانے سے عالم انسانیت کا نقصان نظر آ رہا ہے۔"

اور یقین نے اعتقاد کی شکل ۱۹۴۷ء میں اختیار کر لی تھی اور حال یہ تھا کہ ایک طرف ہندو یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارا وجود خطرے میں ہے، کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ برطانوی سامراج کے ایجنٹ اس وحشت و بربریت کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان اب سنبھالا نہیں لے سکتا اور یہ یقین ان کا ٹھیک ہی تھا۔ مگر انہیں کیا خبر تھی کہ ابھی وہ مسیحا موجود ہے کہ جس نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت میں آزادی کی روح پھونکی تھی وہ مسلمانوں کو پھر ثبوت دے گا۔

آخر کار یہی ہوا سب سے پہلے ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی کی جامع مسجد میں اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

"انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے اور انہیں بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔"

پھر یہ بات ایک دوسرا انداز اختیار کر کے سامنے آئی کہ

"یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی۔ مگر اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے، اور یہی وہ انقلاب ہے کہ جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی اور اس کی جگہ بری شے آ گئی۔۔۔ واقعہ یہ نہیں واہمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بری شے چلی گئی اور اچھی شے آ گئی۔"

لیکن یہ باتیں ساری تمہیدی باتیں تھیں، اصل سوال اکھڑے ہوئے قدموں کا جمانا تھا اور ان کے دلوں سے اس خوف و ہراس کو نکالنا تھا کہ جس نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا، اس کے لئے فرمایا کہ۔

"مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب ہو جانے سے ڈرو نہیں، انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا، آج انھوں نے تمہارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ عیب کی بات نہیں یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو اس کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امّی کی معرفت فرمایا تھا کہ "جو ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لئے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔" ہوائیں آتی اور گزر جاتی ہیں اور یہ صرصر سہی، لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتے آنکھوں امتحان کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔"

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا پیغام تقریر جامع مسجد دہلی ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

پھر دسمبر ۱۹۴۷ء ہی میں اسی سے ملتے جلتے انداز میں لکھنؤ میں دہرائی گئیں، مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے، اور دنیا کی آنکھوں نے یہ منظر دیکھا تو ثابت کر دیا کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں مسلمان موجود ہوں اور آج کسی کو کسی قسم کا کوئی خوف پریشان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اب سوال ملک کی حفاظت اور اس کی ترقی کا تھا، اس پر ہندوستان گامزن ہو چکا ہے۔

"لیکن منزل ابھی ایک احساس کا اور ایک مقصد کا"

خواجہ احمد فاروقی

مردِ آزاد

دہلی کی ڈائری سے

۲۲۔ فروری ۱۹۵۸ء

صدیقی۔ کیا لکھوں؟ حقیقت یہ ہے کہ اب کچھ لکھنے کو نہیں ہے وہ منحوس گھڑی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا، بالآخر آ پہنچی اور حضرت مولانا آزاد ہم سب کو، ساری قوم کو سوگوار چھوڑ کر اپنے آقا سے جا ملے۔ رنج، صدمہ، اس قسم کے سارے الفاظ کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ اور دیدہ و دل کی اُس حالت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو صبح سے اس وقت تک اُن پر گزر رہی ہے۔ کل پرسشِ حال کے لئے دیدہ و دلت پہ حاضر ہُوا تھا۔ عجیب سا مجمع تھا۔ اجمل خاں صاحب ٹیلی فون لئے بیٹھے تھے بلا مبالغہ ہر منٹ پر گھنٹی بجتی تھی اور یہی سوال ہوتا تھا

"اب حضرت کا مزاج کیسا ہے؟"

جواب ملتا، "وہی حال ہے۔ کوئی افاقہ نہیں۔ دعا فرمایئے۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، گھنٹی جلد جلد بجنے لگی اور سوال و جواب مختصر ہوتے ہوتے بس یہ رہ گئے،

"حضرت کا مزاج؟"

"وہی، بدستور" ——— پھر تو خاموشی چھا گئی۔ اتھاہ خاموشی۔ لاکھوں آدمیوں کا ٹھٹ مگر سانس تک کی آواز نہ تھی۔ ہر شخص کا رُخ ہم کنگ ایڈورڈ روڈ کی طرف تھا۔ سارا شہر اُمڈ پڑا تھا مضافات کے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے میرٹھ اور علی گڑھ دہلی کی انگنائی ہیں وہاں سے عقیدت مندوں کا آنا تعجب خیز نہیں [illegible] مدراس، بھوپال، بمبئی، حیدرآباد، کلکتہ، جے پور، سری نگر تک سے [illegible] ہواؤں میں آ گئے تھے۔ تاحدِ نظر آدمی ہی آدمی تھے۔ ہر شخص مغموم،

پر آدمی رنجیدہ۔

میرا جی چاہتا تھا کہ حضرت کو مہندیوں میں دفن کیا جاتا جہاں چند ایسے بزرگوں کی آرام گاہ ہے جن کا زمانہ میں جواب نہیں حضرت شاہ ولی اللہؒ حضرت شاہ عبدالقادرؒ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ حضرت شاہ رفیع الدینؒ حضرت شاہ محمد اسحاقؒ لیکن فیصلہ ہُوا کہ انہیں لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کے میدان میں دفن کیا جائے۔ سب سے الگ۔ خاص الخاص جگہ۔ یہ فیصلہ سب سے ہی مناسب ہے اس لئے کہ مولانا منفرد لوگوں میں سے تھے۔ با ہمہ و بے ہمہ۔ فکر و نظر کی عام راہوں میں وہ کبھی وقت کے معمولی قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ ان کی نظر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہی رہا۔ زندگی بھی لائقِ رشک اور موت بھی لائقِ رشک،

بتدریج خاک دیکھی ہوئے تربت ما
قرآن شاہد گری خاک مردی خیزد

اُن کی زندگی وفاداری و استواری کا کامل نمونہ۔ یہ انسانی ذہن کی عجیب و غریب مثال۔ اُن کا مقصد بلند تھا، اس لئے وفا کا درجہ بھی بلند تھا۔ اور وفاداری بھی ایسی وفاداری جیسے قبلہ نما کی سوئی قبلہ کی سمت ہوا کرتی ہے اس راستے میں کس کس طرح کی ذلتیں برداشت کیں، کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھائیں، کیا کیا سختیاں جھیلیں، نہ پوچھئے

گرد ناک ہے اب تک بھی جبہا ماؤں کی
وہ واقعی بے پایاں ہے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک بہت سی منزلیں طے کرنا پڑتی

اگست ۱۹۵۸ء

ہیں، تو ان کا کوئی جانشین ہے۔ وہ اس قرونکس کے ساتھ فکر اریں داخل ہوئے کر سرِ و دشت شاد ہو جاتے۔ وہ جہاں ہیں اکیلے ہیں۔

مولانا کی عظمت میں شبہ نہیں لیکن جو چیز مجھے رہ رہ کر یاد آتی ہے وہ ان کی شخصیت کا حسن تناسب اور اس کی دل کشی ہموار ہے۔ بعض لوگوں کے یہاں بڑی افراط و تفریط ہوتی ہے۔ آن جب اپنی مصوری میں گم ہوئے تو پھر کسی بات کی خبر نہیں۔ اور دنیا کی طرف توجہ کی تو بس اسی کے ہو گئے۔ Pascal کو حیرت تھی کہ لوگ عاقبت سے بے خبر ہو کر کیسے شاہد و شعر پارے و رامش و رنگ پر میں محو ہو جاتے ہیں۔ (They) Dance and Play the Lute and Sing and Make Verses

ڈی ایچ لارنس کہتا ہے لوگوں کو گرد و پیش کی مسرتوں اور مشکلوں سے آخر کس طرح فرصت مل جاتی ہے کہ وہ ماورائی مسائل پر وقت صرف کر سکیں لیکن مولانا کے وسیع تخیل میں ان دونوں کے لئے گنجائش بھی اور بڑے صحیح تناسب کے ساتھ۔ انھوں نے اسلام اور ہندوستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انھیں لینا چاہیئے تھا۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے انسانیت اور رواداری میں دونوں کی ایک مشترک اساس بھی تلاش کر لی تھی۔ ایک مرتبہ "انسانم آرزو ست" کے سلسلے میں ایک چینی مقولہ بیان کرنے لگے کہ اگر تمہیں ایک سال کا انتظام کرنا ہے تو گیہوں بوؤ، اگر دس سال کا تو درخت بوؤ اور اگر نسلوں کا بندوبست کرنا ہے تو انسان بوؤ۔ ان کے یہاں سارا زور انسان اور انسانیت ہی پر ہے۔ قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی پر ہے۔ لیکن اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور بھی شامل ہے۔ انھوں نے اپنے اعجازِ عمل سے تاریخ کی تخلیقی رَو کو موڑ دیا اور ہمیں وہ قدریں دیں جن کی روشنی میں چل کر ہم حیات کے مراتبِ عالیہ پر فائز ہو سکتے ہیں۔

گویند پس از ہزار سال از عالم   روشن جانے ز آسمان زیر آید

حاقانی ازاں جنس درین دہر مجو   پر دہ منشیں کہ کاروان دیر آید

آپ کا

خواجہ احمد فاروقی

حاصلِ گذارش

"ہم کو اسے سفر میں نکلے ہوئے دو سال ہو گئے۔ ہمارا سفر تاریکی میں نہ تھا بلکہ دوپہر کی روشنی میں تھا اور دنیا اسے دیکھ رہی تھی۔ ہم اگر حرکت میں رہے ہیں تو اس پر پردہ نہیں پڑا ہے اور اگر جمود و عطلت میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے ہیں تو وہ بھی کوئی راز نہیں ہے۔ اگر اپنے سفر کا کچھ حصہ طے کر سکے ہیں تو دیکھنے والے اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ اور اگر راہ کی دشواریوں سے وامادہ رہ گئے ہیں تو ہمت کا ترازو اور قدم کی لغزش بھی پیش ما را رہے۔ متاع بالکل نئی تھی اور اپنے سفر کے لئے خود ہی ایک نئی راہ نکالی گئی تھی۔ نہ تو ہمارے سامنے نمونہ تھا اور نہ کوئی رہنمائی کی مادی روشنی —

بے عشک رفت و دامنِ رہبر ترہ کرد   زاں چشمہ کہ خضر و سکندر دھو کنند

قوموں اور جماعتوں میں انقلاب و تغیر کی دعوتوں کے لئے داعی کا کام ایک ایسا دشوار گذار سفر ہے کہ اگر قوموں کی بادیہ پیمائی اور تگ و دو کے بعد سلامتی کا ایک قدم بھی طے ہو جاتا ہے تو اس کی کامیابی رشک انگیز اور اس کی رہ مسدی حق و نشاط کی مستحق ہوتی ہے۔ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کو گرا کر نئی دیوار کے بنانے کے لئے کس قدر سامان اور وقت مطلوب ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کے لئے تو وقت کا کوئی سوال ہی نہ ہونا چاہیئے جو معتقدات و اعمال کی ایک پوری آبادی کو بدل دینا چاہتے ہوں اور صرف کسی دیوار اور محراب ہی کو نہیں بلکہ شہر کی تمام عمارتوں کو از سرِ نو بنانے کے آرزو مند ہوں"

(الہلال جون ۱۹۱۴ء)

اعجاز صدیقی

تیرے بعد!

بہ یادِ ابوالکلام آزادؒ

تھا جو اک سلسلۂ لطف و عنایت تجھ سے
تلخیوں کو بھی ملا رنگِ حلاوت تجھ سے
کسی دلدار سے کی جب بھی شکایت تجھ سے
مل گئی چہرۂ افسردہ کو رنگت تجھ سے
پائی اک لذتِ بے حرف و حکایت تجھ سے
اے کہ باقی تھی تب و تابِ محبت تجھ سے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا "تیرے بعد"

وضعداری وہ تری، وہ تری گفتار کا ڈھنگ
وہ خموشی تری اور وہ لبِ اظہار کا ڈھنگ
کجکلاہی وہ تری، وہ تری رفتار کا ڈھنگ
خلوتِ شب میں وہ تیرے دلِ بیدار کا ڈھنگ
صبح کے گیت میں وہ فکرِ فسوں کار کا ڈھنگ
"جانے" کی چاپ سے اٹھتے ہوئے اسرار کا ڈھنگ
ہوئی معزولیِ انداز و ادا "تیرے بعد"

جیسے یکبارگی خضرِ رہِ منزل کھو جائے
کوئی زحمت کشِ ہر جادۂ مشکل کھو جائے
جیسے محفل ہو، مگر صاحبِ محفل کھو جائے
بھیڑ میں جلووں کی تابِ نگہ و دل کھو جائے
شبِ تاریک میں جیسے مہِ کامل کھو جائے
صحتِ طوفاں ہو اور دامنِ ساحل کھو جائے
راستہ بھول گئے راہنما "تیرے بعد"

موم ہو کر تری مٹھی میں رہا آہنِ وقت
ایک تھی گردشِ مینا ہو کہ ہو گردشِ وقت
مستیِ راہبراں جب بھی بنی رہزنِ وقت
ہوشیاری نے سنبھالا تری اک توسنِ وقت
تو کہ تھا مے کدۂ وقت میں تر دامنِ وقت
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ" وقت
تھے مکرر لبِ ساقی پہ صلا "تیرے بعد"

تیرے خاموش تدبر کے اشارات کہاں
سب میں وہ قوتِ تجزیۂ حالات کہاں
تھا یہ معلوم تجھی کو کہ گھنی رات کہاں
دن کے اجیاروں سے کھا جاتی ہے خود مات کہاں
ختم ہو سکتی ہے ہر شورشِ آفات کہاں
بن کے خورشید چمک سکتے ہیں ذرات کہاں
سرد آتش کدۂ فکر ہوا "تیرے بعد"

گو ترے طرزِ تکلم کا وہ جادو نہ رہا
نگراں اب وہ ترا دیدۂ ہر سو نہ رہا
نفسِ گرم سے پھیلائے جو خوشبو نہ رہا
پھول بن جانے کے قابل کوئی آنسو نہ رہا
دل کی تسکیں کا باقی کوئی پہلو نہ رہا
وہی ہنگامۂ محفل ہے مگر تو نہ رہا
"بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا" "تیرے بعد"

ہیں غلط سمت خیالات کے دھارے اب بھی
ضد پہ ہیں، کہنہ روایات کے مارے اب بھی
ہیں پسِ پردۂ انفاس شرارے اب بھی
آندھیاں دیتی ہیں شعلوں کو سہارے اب بھی
شر پہ آمادہ ہیں کچھ لوگ ہمارے اب بھی
ہیں وہی برقِ سیاست کے نظارے اب بھی
"کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا" تیرے بعد

لوگ کہتے تھے ترا طوطیِ راز جنھیں
اور تو نے ہی دیا شعلۂ آواز جنھیں
سوز دیتی رہی تیری نگہِ ناز جنھیں
تو نے بخشی تھی نئی قوتِ پرواز جنھیں
وہ کہ تھا جوشِ زبا تیرا ہر انداز جنھیں
تھا ترے رنگِ طبیعت سے بڑا ساز جنھیں
"اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا" تیرے بعد

یوں تو دیکھے کئی، شامل ترے ماتم میں سبھی
چند دن کا تھا مگر مشغلۂ ہمدردی
اب نہ وہ آہوں کی شدت ہے، نہ وہ نوحہ گری
قوم نے ملتے تری موت کی وہ قدر نہ کی!
تیرے اخلاص کی، دینے کی طرح داد نہ دی
"غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی"
"کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا" تیرے بعد

حل کیا وقت کا پیچیدہ سے پیچیدہ سوال
حدِ امکاں کے قریب آ گیا ہر امرِ محال
فیصلوں کو ترے ٹھکرائے، یہ تھی کس کی مجال
سب نے تجویزوں کو مانا تری بے قیل و قال
اللہ اللہ تری فکر کا وہ اوج و کمال
جنھیں گمراہیِ منزل سے ہو بچنے کا خیال
چُوم لیں وہ ترا نقشِ کفِ پا تیرے بعد

ہمہ دانوں میں مسلّم ہمہ دانی تیری
بھول سکتا نہیں دل، سحر بیانی تیری
لے کر تحریر ہر اک گنجِ معانی تیری
اے کہ تصنیف نہیں کوئی بھی ثانی تیری
بے نشانی سے بھی پیدا ہے نشانی تیری
وقت دہرائے گا تا حشر کہانی تیری
تذکرہ ہوگا بہر حال ترا تیرے بعد

تیرا کردار مثالی وطنیت کے لئے!
تو نے عزت کے سہے وار محبت کے لئے!
تو شریعت کے لئے تھا کہ امامت کے لئے!
تو قیادت کے لئے تھا کہ سیاست کے لئے،
یہ سمجھنا ہے کٹھن چشمِ حقیقت کے لئے،
تیرا ہونا تھا کسی سخت ضرورت کے لئے!
راز قوم اور وطن پہ یہ کھلا تیرے بعد

یہ وطن، تیرا وطن، میرا وطن، سب کا وطن
یہ چمن، تیرا چمن، میرا چمن، سب کا چمن
یہ ہمالہ کی زمیں، رقص گہِ گنگ و جمن
منبعِ علم و ادب، مرکزِ تہذیب و فن
جس میں پیوست تری فکرِ رسا، سوزِ سخن
ٹانکنے والا ہے تاروں کو سبو میرا بھی
پوچھ مجھ سے، کہ یہ ہو جائے گا کیا تیرے بعد!

ریاض الرحمٰن شروانی

مولانا آزاد کی شخصیت

"آثارِ ابوالکلام آزاد" کی روشنی میں

مولانا آزاد کی شخصیت جتنی عظیم تھی اُس اعتبار سے اُن پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جتنا لکھا گیا ہے اُس میں بھی اکثر کے بارے میں یہ کہنا دشوار ہے کہ اُس نے اُن کی عظمت کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ انگریزی میں مہادیو ڈیسائی کی کتاب اور اُردو میں قاضی عبدالغفار کی "آثارِ ابوالکلام آزاد" شاید اس وقت تک اس معیار پر سب سے زیادہ پوری اُترتی ہیں۔ قاضی عبدالغفار سے اُردو ادب کے طالب علم بحیثیت ایک انشا پرداز، صحافی، طنز نگار۔ اور سوانح نویس کے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور حیثیتوں سے قطع نظر سوانح نگار کی حیثیت سے "آثارِ جمال الدین افغانی" کی ترتیب کے بعد اُن کا پایہ ہمارے سوانحی ادب میں عام طور تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انھیں دوسروں کے مقابلے میں مولانا آزاد سے قرب بھی زیادہ حاصل رہا اور اس لئے اُن کی نظر حضرت مولانا کے ذہن کے پوشیدہ گوشوں تک زیادہ پہنچ سکی۔ آج کی صحبت میں یہ دیکھنا ہے کہ قاضی عبدالغفار اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں کہ ہمیں ان پوشیدہ گوشوں کی جھلکیاں دکھا سکیں اور حضرت مولانا کی عظمت کے ساتھ انصاف کر سکیں۔

قاضی عبدالغفار نے شروع ہی میں یہ اعتراف کیا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل کام ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ غلط اندازہ کرنے کے اندیشے کو دل سے نکال دیا جائے۔ وہ خود یہ اندیشہ اپنے دل سے دُور نہیں کر سکے ہیں۔ وہ مولانا آزاد کو ایک "بہت مشکل انسان" سمجھتے ہیں اور ان اعترافات کے بعد اپنے کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس سے یہ تو فائدہ ہوتا ہے کہ اُن کا قاری اُن سے مولانا کی شخصیت کے بارے میں عجائب و لطائف سُننے کا متوقع نہیں رہتا لیکن یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ خود اُن کے ذہن میں تردد اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے جس کا اثر اُن کے کام پر بھی پڑتا ہے۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی شخصیت کے جس پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ اُن کی "انفرادیت" ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔ "جب میں نے یہ مطالعہ شروع کیا تو میرے اس تبصرے کا موضوع، تو مولانا کی شخصی زندگی کے معمولات تھے، نہ اُن کی خاندانی یا ذاتی عظمت تھی نہ اُن کی سیاسی زندگی کے کارنامے تھے۔ نہ اُن کا مجتہدانہ علم و فضل تھا۔ بلکہ میری فکر و نظر کا مرکز صرف اُن کی مخصوص "انفرادیت" تھی جس کے نقش و نگار اُن کی تحریروں میں نمایاں ہوتے ہیں۔" "مولانا کی اس "انفرادیت" میں سب سے زیادہ حصّہ اُن کی مُحیّر العقول "جینیس" کا ہے جس کے بارے میں قاضی عبدالغفار کی رائے ہے۔ "جب مولانا دُنیا کے سامنے آئے تو وہ اپنے ساتھ علم و فضل اور تقدس کی روایات ہی نہیں لائے بلکہ ایک طاقت ور "جینیس" کی بے پناہ قوتِ اجتہاد بھی لے کر آئے جس نے انھیں آباؤ اجداد کے حلقۂ افکار کے باہر بہت سی نئی راہیں دکھائیں اور دُنیا کو ایک ایسی زبردست "انفرادیت" سے آشنا کیا جیسی کہ صدیوں سے اس ملک میں پیدا ہوئی تھی۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی جینیس نے اُن کی "انفرادیت" کو جنم دیا اور اُن کی انفرادیت نے ایک طرف اُن کی شخصیت

میں وہ حسن اور عظمت پیدا کر دی جس کی اس ملک کی حالیہ تاریخ میں سوائے ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے کوئی دوسری مثال نہیں ملتی اور دوسری طرف اُن کے قلم سے ایسے جواہر ریزے نکلوائے جنھوں نے اُردو زبان کو امر کر دیا۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی "انفرادیت" کو اُن کے ادب میں جابجا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں اُس کا سراغ ملا ہے۔ بڑے ماہرانہ انداز میں نقاب کشائی کی ہے۔ مولانا سب سے زیادہ "غبارِ خاطر" میں کھل کھیلے ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ یہ خطوط اشاعت کے لئے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ ان کا مقصد خود اپنی طبیعت کا بار ہلکا کرنا اور اپنے "حبیبِ لبیب" اور "صدیقِ مکرم" سے "ہم کلامی" اور "مخاطبت" کی خوشی وقتی حاصل کرنا تھا۔ یہاں بھی قاضی صاحب نے بھی مولانا کی شخصیت کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد "غبارِ خاطر" ہی سے لی ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولانا کی "انفرادیت" نے اُن کی شخصیت میں بڑا حسن اور عظمت پیدا کر دی لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ اسی "انفرادیت" ہی کی بدولت اُن کے اور عوام کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار کھڑی ہو گئی جو ایک سیاسی کارکن اور قومی رہنما کے منصب سے میل نہیں کھاتی اور جس نے انھیں ہندوستان کی عوامی زندگی میں گاندھی اور جواہر لال یا محمد علی اور عبدالغفار خاں نہیں بننے دیا۔ اس سلسلے میں قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں :- "اُن کی انفرادیت عوام کی ذہنی سطح سے اس قدر بلند ہے کہ کوئی عامی اُسے عام پیمانے سے ناپ تول نہیں سکتا۔ مولانا کی یہ نفسیاتی کیفیت ، جس کا خود انھوں نے "غبارِ خاطر" کے مکتوبات میں بہت ملیح استعاروں کے اندر ذکر فرمایا ہے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان ایک اُونچی دیوار بن گئی ہے۔ کون جانتا ہے کہ اگر یہ "اُونچی دیوار" نہ بن گئی ہوتی تو آج ہندوستان ، خصوصاً ہند و ستانی مسلمانوں کی تاریخ کس طرح مرتب ہوتی ہوتی۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی اس "انفرادیت" اور "تنہائی پسندی" کی توجیہ "غمگین احساس" سے کی ہے۔ اس معاملے میں انھیں مولانا کے شریکِ حال حکیم اجمل خاں (جن کے بارے میں قاضی صاحب کی تصنیف "حیاتِ اجمل" شائع ہو چکی ہے) نظر آتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ انھیں حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت کے مطالعہ کا کافی موقع ملا تھا۔ اور اس لئے انھوں نے "ایک ایسی حسدی کیفیت کو بچانے کے کچھ اشارے پائے تھے" لیکن وہ مولانا کے اس قدر قریب کبھی نہیں پہنچ سکے اور اس لئے اُن کی فطرت کے تقاضوں کو اُن کی تحریروں ہی میں تلاش کرنا ضروری ہو گیا۔ غالباً اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکیم اجمل خاں کی شخصیت اتنی "مشکل" نہیں تھی جتنی مولانا آزاد کی تھی۔

اس مرحلے پر قاضی عبدالغفار مولانا آزاد کی فطرت کے "غمگین احساس" پر مزید روشنی ڈالنے سے قاصر رہے ہیں ، وہ ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ آخر اس "غمگینی" کا اصلی سبب کیا ہے۔ صرف "فطرت کا کمال" ہی تو اس کا واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عرضی "آثار" کے مطالعہ سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح مولانا آزاد کی شخصیت عجوبۂ روزگار تھی۔ اسی طرح اُن کی شخصی اور سیاسی زندگی کے واردات اپنے اندر جیتم بینا کے لئے بڑا سرمایۂ عبرت رکھتے ہیں۔ اُن کی پیدائش ایک خالص مشرقی بلکہ مولویانہ گھرانے میں ہوتی ہے۔ انھیں تعلیم وہ ملتی ہے جو سوائے تنگ نظری اور خود بینی کے دوسرا کوئی سبق نہیں پڑھا سکتی چونکہ وہ مشائخ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اُن کے گرد عقیدت مندوں اور ارادت کیشوں کا ایسا ہجوم رہتا ہے جو اُن کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتا ہے اور اُن کی طرف پیٹھ کر کے چلنا عذابِ الٰہی کا مستوجب سمجھتا ہے۔ ان حالات اور ایسے ماحول میں انھیں جو کچھ بننا چاہیئے تھا اُس کے بالکل برعکس وہ زندگی کے ابتدائی دور ہی سے وسیع النظری اور خدمتِ خلق کے مسلک کو اپناتے ہیں اور عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر اصلاحِ وطن کی تحریک میں تن من سے شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں انھیں ایک اور ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں برادرانِ وطن تو بڑھ بڑھ کر حصہ لے رہے ہیں لیکن مسلمان من حیث القوم اُس سے الگ ہیں اور سرسید اور اُن کے جانشینوں کے بتائے ہوئے راستے ہی پر چلنا باعثِ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے جذبات کو شدید ٹھیس لگتی ہے اور وہ قلم کو خونِ دل میں ڈبو کر اُس سے مسلمانوں کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وہ جو کچھ اور جس انداز سے لکھتے ہیں۔ اُس سے ایک طرف تو عام مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن دوسری طرف بوڑھے رہنماؤں کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتی ہیں اور غیر ملکی حکومت کے اشارے پر اُن کے خلاف بہتان تراشی اور الزام آفرینی کا طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ مگر وہ اُس کی ذرا پروا نہیں کرتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ اُن کے لئے وہ وقت انتہا سخت ہو تا ہے جب اس ملک میں بسنے والے دو بڑے فرقے ہندو اور مسلمان ، اپنی سادہ لوحی کے سبب خود غرض رہنماؤں اور غیر ملکی حکمرانوں

کہ آزاد کاربن کر باہم دگر دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور ملک کی آزادی اور اتحاد کا جو نقشہ انھوں نے اپنے ذوقِ عمل اور رجحاتِ کردار سے بنایا تھا وہ بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی پر بس نہیں ہوتی بلکہ ملک کے فرقہ پرست عناصر ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے "سوادِ اعظم" کے دلوں میں اُن کے خلاف بے سروپا شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرنے ہیں یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ وہ لوگ جن کی خدمت اور رہنمائی کی خاطر انھوں نے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کی تھیں اور قسم قسم کے الزامات اٹھائے تھے اُن سے واقعی بدظن ہو جاتے ہیں اور اُن کے ہر قول اور ہر فعل کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُن کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اُن کی شان میں گستاخی اور بدزبانی سے باز نہیں آتے۔ اس کے جواب میں وہ یہ تو نہیں کرتے کہ اپنے مخالفوں پر کیچڑ اچھالیں اور اُن کی بُرائی کا بدلہ بُرائی سے دیں اس لئے کہ یہ اُن کی شانِ استغناء اور تحمل فطرت کے منافی ہے لیکن یہ ضرور کرتے ہیں کہ ایک گنبد کے اندر جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے (اور اگر ہے تو کوئی چور دروازہ ہے) اپنے وجودِ معنوی کو بند کر بیٹھتے ہیں اور دنیا والوں کی نظروں سے اتنے دُور ہو جاتے ہیں کہ اُن کے لئے سوائے اس کے چارۂ کار نہیں رہتا کہ "اُن کی فطرت کے تقاضوں کو اُن کی تحریروں ہی میں تلاش" کرنے کی کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر مولانا کی تحریروں پر بھی پڑتا ہے اور اُن کی فطرت کا "تمکین احساس" جسے اُن کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے طرزِ عمل سے سخت تقویت پہنچتی ہے۔ اُن کے ادب میں ایک ایسی انفرادیت اور گداز پیدا کر دیتا ہے جس کا دوسرے ادیبوں کے ہاں سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔ مولانا نے "قبا۔ خاطر" کے انداز میں اپنے آرٹ کے بنیادی عناصر کی نشاندہی فرما دی ہے وہ "انانیتی ادب" کی اصطلاح میں اپنے ادب کی فطرت کو نام زد فرماتے ہیں۔ مولانا نے "انانیتی ادب" کے سلسلے میں دنیا کے مختلف نامور ادیبوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس فہرست میں خود مولانا کا نام بھی کافی اونچے مقام پر جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اور اُردو ادب میں تو سوائے قاضی عبدالغفار کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدّت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں۔ دوسری زبانوں کے "انانیتی ادب" کو سمجھنے میں بھی ہمیں سب سے زیادہ مدد مولانا ہی کی تحریروں سے ملتی ہے۔ جیسا کہ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ "انانیتی ادب خاص الخاص لطیف افراد ہوتے ہیں جن کا ادب عام تعداد میں تو نہیں جا سکتا اور جن کو ادب و تصنیف کے عام کُلّیات پکڑ نہیں سکتے۔" اس اعتبار سے مولانا کا ادب سامنے رکھ کر سمجھ لینا کچھ ایسا دشوار تو نہیں ہے"

مولانا کے ادب کی اس تاریخ کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں جس شخصیت کا نقش اُبھرتا ہے اُس کے سب سے نمایاں اجزائے ترکیبی قاضی عبدالغفار کے الفاظ میں "خودداری، انانیت، انفرادیت، کم آمیزی اور احساسِ برتری ہیں۔" جو عقلیت اور Intellect کا ایک طبقاتی امتیاز ہے۔"

یہ خودداری اور کم آمیزی "مولانا کی شخصیت میں جو جادو جگا دیتی ہے اُس کی طرف مضمون کے شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس "خودداری اور کم آمیزی" کی بدولت ہم نے کھویا کیا اور پایا کیا؟ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ہمیں ایک اوّل درجے کی "جینیس" میسّر آگئی، خود مولانا کو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ عوام کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی زد سے بہت دُور نکل گئے۔" لیکن ساتھ ہی ہم سے ایک ایسا عظیم سیاسی رہنما کھو دیا جو اگر اس درجہ "خوددار اور کم آمیز" نہ ہوتا تو اُس کا مقام کسی طرح گاندھی جی سے کم نہ ہوتا۔ افسوس ہے کہ مسئلے کے اس پہلو سے قاضی عبدالغفار نے بحث نہیں کی ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت کے نمایاں ہونے کا ایک اور موقع بھی بار بار آتا ہے اور وہ ہے اُن کے مخالفوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا کے مخالفوں نے انھیں عوام کی نظر سے گرانے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے اور طرح طرح کے نام دھرے۔ لیکن مولانا نے کبھی اپنی زبان یا قلم کو اُن کی مخالفت سے آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ اُن کے اعتراضات اور الزامات کا جواب دینا بھی اپنے لئے کسرِ شان ہی سمجھا۔ اس ملک کی سیاسی زندگی کی عام اخلاقی سطح کو بلند کرنے میں مولانا نے جیسا بڑا کام کیا ہے اُس میں اُن کے ساتھ دوسرا نام گاندھی جی ہی کا لیا جا سکتا ہے۔ اس عارفانہ یک سوئی کے مظاہرے میں اُن کی انفرادیت اُن کے بہت کام آئی۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں "رائے اور خیالات کو وہ ایسی بلندی سے دیکھتے رہے اور عام مباحث میں اُلجھنے کو انھوں نے اپنے شخصی وقار کے اس قدر منافی سمجھا کہ ایسے مسائل میں افکار اور تصوّرات کا ضبط ایک سنجیدہ خاموشی اُن کے علم و عقل کی ایک ضروری شرط قرار پائی۔" مولانا آزاد کی طرح قاضی عبدالغفار بھی فرقہ واریت کے بہت

بڑے دشمن ہیں اور اسی لئے جہاں کہیں اُن کا قلم مولانا کے مسلم فرقہ پرستوں سے تصادم کی نقش آرائی کرتا ہے وہاں اُس میں بڑی جان آجاتی ہے اور وہ بہت دل فریب گل بوٹے کھلانے لگ جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:" مولانا کی شخصی اور معنوی عزم و استقامت کا امتحان حکومت کے جبر و استبداد کی کسوٹی پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا کہ وہ آزمائش تھی جس میں مولانا اُس وقت مبتلا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گزر چکا، وہ پھر ایک دفعہ پھر سامنے ہو گئی اور ایک دفعہ پھر حکومت نے فرقہ وارانہ تعصبات کی آگ روشن کر دی ... بہت سے بلند آہنگ لیڈر تھے جو اس امتحان میں پورے نہ اُتر سکے، لیکن مولانا خود اپنی "قوم" کے ہاتھوں (جب وہ گمراہ ہو چکی تھی) سب کچھ جھیل گئے۔ برطانوی حکومت کا فولادی پنجہ اُن کے وجود معنوی کو اس قدر مجروح کبھی نہ کر سکا جتنے زخم خود اُن کی گمراہ "قوم" نے اُن کے دل و دماغ پر لگائے۔ مگر انھوں نے ان تمام جراحتوں کو شکوہ و شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر لائے بغیر گوارا کر لیا۔

مولانا کی اس استقامت میں بہت کچھ دخل اُن کی روحانی کیفیت کو بھی تھا ... روحانی حلقوں میں انھوں نے اپنے سے کم درجے کی مخلوق سے شکوہ شکایت کرنے کی ادنیٰ سطح پر جانا اپنے وہبی مقام کی توہین سمجھا ... اُس احساس خودی اور علم و فضل کی اُس انانیت نے جو مولانا کے کردار کی بنیاد ہے اُن کو ہمیشہ راہ و رسم عام سے علیحدہ رکھا اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی ایک پُرتمکین (ریزرو) خاموشی ہی تنہا اُن یورشوں کا مقابلہ کر سکی جو سال ہا سال ہر قدم پر اُن کا راستہ روکتی رہیں ... مولانا ہمیشہ سب سے زیادہ اُن حملوں کی زد پر رہے جو "لیگ" سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں پر کئے جاتے تھے۔ جب کانگریس کی تحریک آزادی کے دوران میں خدا اور رسول کے نام لے کر مسلم لیگ کی ہدایت کو جاہل مسلمانوں کے دلوں میں بٹھایا گیا اور ایک خود غرض اور ناعاقبت اندیش قیادت نے جہلا کے جذبات کو اتنا گرم کر دیا کہ عقل و فہم کے تمام راستے مسدود ہو گئے تو اُس زمانے میں مولانا کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ سب کو معلوم ہے۔ قائداعظم نے انھیں "شو بوائے" کا خطاب عطا فرمایا ... جتنی گالیاں انھیں دی گئیں شاید ہی متحدہ کے کسی دوسرے بڑے لیڈر کے حصے میں آئی ہوں ... اور یہ سب ایک ایسا امتحان تھا جس سے مولانا اپنی متانت پر ایک شکن ڈالے بغیر گزر گئے۔" اس سلسلہ میں میں نے اتنے طویل اقتباسات اس لئے دیئے ہیں کہ قاضی عبدالغفار کی طرح میرا بھی یہ خیال ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت اور اُس کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے سب سے اہم اُن کی زندگی کے اُس پہلو کا مطالعہ ہے، جہاں اُن کا تصادم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست سے ہوا۔ غیروں کے ہاتھ سے تلوار کے زخم کھا کر بھی دل و دماغ کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو اپنوں کی زبان سے نکلا ہوا ایک تلخ لفظ کر دیتا ہے۔ آدمی جب یہ سمجھے کہ ہم جن کی صداقت کے لئے کام کر رہے ہیں وہی ہماری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اُن کے پھوڑ کاٹنے والے وہ لوگ ہیں جن کی ساری زندگی اوّل و آخر حکومت کی کاسہ لیسی میں گزری ہے ورنہ کم از کم ذاتی عافیت کوشی کی خاطر قومی زندگی کی ہماہمی اور نشیب و فراز سے تو ضرور ہی کنارہ کش رہے ہیں تو دل و دماغ پر جو بھی گزر جائے کم ہے لیکن ان حالات میں بھی ایک طرف خدمتِ خلق میں بدستور مصروف رہنا اور دوسری طرف اپنے زبان و قلم کو مخالفت کی آلودگی سے ملوّث نہ ہونے دینا اتنا بڑا کام ہے جس کی مثالیں تاریخ میں ڈھونڈنے سے دو چار ہی مل سکتی ہیں اور یہ کام کوئی ایسا شخص ہی انجام دے سکتا ہے جس کی افتادِ طبع نے اُسے عام سطح سے بہت بلند و بالا مقام پر متمکن کر دیا ہو۔

زندگی کے سفر میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور قسم قسم کے نشیب و فراز آتے ہیں جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے اور پھر زندگی جتنی اعلیٰ اور بامقصد ہوتی ہے اُتنی ہی اُس کی راہ میں رکاوٹیں بھی زیادہ آتی ہیں۔ ان رکاوٹوں سے کامرانی کے ساتھ گزرنے کے لئے انسان کو جو جدوجہد کرنی پڑتی ہے وہ اُس کی شخصیت میں کچھ ایسے عناصر کو اُجاگر کر دیتی ہے جنھیں "تضاد" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن زندگی کا یہ تضاد اُس میں ایک خاص قسم کی جاذبیت اور کشش پیدا کر دیتا ہے اور اُسے ایک ایسا "انسانی رنگ" Human Touch دے دیتا ہے۔ جس سے وہ بصورت دیگر محروم ہی رہتا۔ مولانا آزاد نے "غبار خاطر" کے ایک خط میں اورنگ زیب کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ "وہ لوہے اور پتھر کا انسان" جب ایک حسین اور بے باک لڑکی سے متصادم ہوا تو اُس کا اس درجہ اثر قبول کیا کہ اُس کے ہاتھوں اپنی سب سے عزیز متاع یعنی دین و ایمان فروخت کرنے کو تیار ہو گیا۔ ہم اب تک اورنگ زیب کو ایک سادگی پسند، دیندار بادشاہ، اور سیاہ جابر بادشاہ، ہوشیار سپہ سالار اور سخت گیر اور بے لچک انسان کی حیثیت سے جانتے آئے ہیں۔ اس لئے جب ہماری نظر کے سامنے اُس کی زندگی کا یہ "تضاد" آتا ہے تو ہمیں حیرت تو ضرور ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ہمارے لئے اُس کی شخصیت میں ایک ایسا حُسن اور دلربائی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ اب تک قطعاً محروم تھا۔ قاضی عبدالغفار نے بھی مولانا آزاد کی شخصیت کے "تضاد" کا تذکرہ

کیا ہے اور بتایا ہے کہ "متضاد عناصر کے تصادم" نے اُسے کس طرح متحرک Dynamic بنا دیا تھا۔ وہ مولانا کی زندگی کے ان متصادم عناصر کا سراغ خود اُن کی تحریروں میں لگاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں "مولانا اپنی فطرت کے تضادات کو شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں اکثر بیان فرماتے ہیں مثلاً غبار خاطر کے ایک مکتوب میں پہلے تو آتش دان سے اپنی طبیعت کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اپنے پیرائے کے سنوں کو سامنے لاتے ہیں۔" آگے چل کر وہ یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ مولانا اپنی فطرت کے ان تضادات کی وضاحت کیوں ضروری خیال فرماتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "مولانا کے اندیشہ اس سے موجود ہے کہ عوام اُن کی زندگی کے تضادات سے بے خبر نہیں ہیں اور بعض اوقات جب ایسی کوئی واردات پیش آ جاتی ہے جس سے یہ تضاد ظاہر ہو سکے تو لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک ہی طبیعت کے یہ دو رُخ کیوں کر ممکن ہوئے۔ مولانا اپنے شاعرانہ انداز میں اس تضاد کی تصریح فرماتے ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بسا اوقات سطح کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے اُس سے بالکل مختلف بہت کچھ سطح کے نیچے ہوتا ہے۔ مولانا کی شخصیت کے اس "تضاد" پر بھی اُن کی بے پناہ "انفرادیت" کی چھاپ پوری طرح لگی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب رقم طراز ہیں "زندگی کے حقائق کو وہ بار بار ایسے ہی رنگ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ہر چار سطروں کے بعد ایک نقطہ اُن کی بے پناہ اور بے محابا انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنی زندگی کے ایک خاص اسلوب کا جو معیار اور زاویہ قائم کر دیا ہے وہ کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ نہ اُن کی خلوتوں میں اور نہ سیاسی مشاغل کی جلوت میں۔"

انسان کے لئے حد سے زیادہ خوشی اور حد سے زیادہ رنج کے مواقع ایسے ہوتے ہیں جب اس کا توازن دہنی قائم نہیں رہتا اور وہ اپنی انفرادیت کو باقی نہیں رکھ پاتا۔ لیکن مولانا آزاد اس آزمائش سے بھی پوری طرح کامیاب گزرتے ہیں۔ قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے دوران میں انھیں اپنی بیگم صاحبہ کی شدید علالت کی اطلاع پہنچتی ہے اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ حکومت برطانیہ سے درخواست کریں تو انھیں بیگم صاحبہ کی تیمارداری کے لئے رہا کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی خودداری انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی اور باوجود اس کے کہ وہ بیگم صاحبہ کو دیکھنے کے لئے بہت بے تاب ہیں مگر پھر بھی حکومت سے اس قسم کی درخواست کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور قدرت دیگر پر جو کچھ گزرتی ہے اُسے برداشت فرماتے ہیں اور اس طرح برداشت فرماتے ہیں کہ روز مرہ کے معمولات میں ذرا فرق نہیں آنے دیتے، یہاں تک کہ جیل کے ساتھیوں کو بھی (جن میں اُن کے بعض ایسے قریبی دوست شامل ہیں جیسے پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود) حقیقی واردات قلب سے آشنا کرنا پسند نہیں فرماتے۔ البتہ ایک "غائب از نظر، ہم نشین دل" کے نام ان واردات کو صفحۂ قرطاس پر ضرور مرتسم کرتے جاتے ہیں اور وہ بھی غالباً اس لئے کہ انھیں ان مکتوبات کے مکتوب الیہ تک پہنچنے کا پورا یقین نہیں ہے۔ اُس زمانے میں مولانا کے محسوسات کتنے شدید تھے اور انھیں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ اس کا حال خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے "اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اُسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ، عادت اور مائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں ہونے دیتے۔ قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی، محض صورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا مگر دل کو نہیں بچا سکا۔" بہرحال جو وقت آنا تھا آ کر رہا۔ غیر شخصی کر مولانا کی جو کیفیت ہوئی ہوگی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن اُن کی انفرادیت اس جاں گسل موقع پر بھی کس طرح سرفراز رہی اُس کا حال سنئے: "سب سے پہلے یہ کوشش کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کے جو معمولات ٹھہرائے جا چکے ہیں اُن میں فرق نہ آنے پائے۔ چونکہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا گھنٹوں کے حساب سے ناپ ہو گیا ہے اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اُس کا ساتھ دینا پڑا۔ یہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔" یہاں یہ خیال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ کم از کم اس موقع پر مولانا کی انفرادیت میں آمد Spontaneity باقی نہیں رہی بلکہ اُسے قائم رکھنے اور برقرار رکھنے کے لئے انھیں خاص طور پر جد و جہد کرنی پڑی اور اسی کا دوسرا نام تصنع اور بناوٹ ہے۔ اس طرف قاضی عبدالغفار نے بھی اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں "ضبط و تحمل بھی اسی انفرادیت کے سرفرازانہ قرار کی گویا

ایک بناوٹ ہے۔ اس بناوٹ کو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے اس موقع پر اپنے جذبہ کو باطل سے متاثر نہ ہونے دیا۔" اس واقعہ سے مولانا کی عظمت کم نہیں ہوتی، بڑھ جاتی ہے۔ صداقت کے تعمق اور بناوٹ کی اس طرح نقاب کشائی کرنا ایک بڑے آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ہر کہ ومہ اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہے

مولانا آزاد کی انفرادیت نے انھیں جیسے سیاست اور ادب میں ایسے ہی مذہب میں بھی شاہراہِ عام سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے وہ ایک علمی اور مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور اس طرح مذہب اُن کی گھٹی میں پڑا تھا لیکن ورثے میں انھیں مذہب کا جو تصور ملا تھا وہ بہت جامد اور بے روح تھا، وہی تقلیدی اور آبائی مذہب جو ہم میں سے اکثر لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ لیکن مولانا اس پر کیسے قانع رہ سکتے تھے۔ زندگی کے ابتدائی دَور ہی میں اُن کے دل میں شک کا کانٹا چُبھا اور اُس کی خلش اتنی بڑھی کہ اُس نے انھیں الحاد اور بے دینی کی سرحد تک پہنچا دیا، مگر مولانا مبدء سے طبعِ سلیم اور فکرِ رسا لے کر آئے تھے اس لئے اُن کے قدم یہاں رُک نہیں گئے بلکہ جلدی ہی وہ اس مقام پر پہنچ گئے جو مذہب کا اصلی مقصود ہے۔ جس عمر میں دوسرے لوگ زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اُس عمر میں مولانا سفر کی تکان دُور کر رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا کے مذہبی عقائد سے خاصی طویل بحث کی ہے لیکن چونکہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اُس کے بارے میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتے، البتہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ یہ مولانا کی انفرادیت ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ مذہبِ اسلام کو عورتوں کی ترقی، موسیقی کے ذوق، جہادِ حریت، متحدہ قوم کی تشکیل اور غیر مسلم موحدین کی نجات کی راہ میں حائل نہیں سمجھتے تھے اگرچہ اپنے ان عقائد کے اظہار میں انھیں ایک طرف جُبّے اور عمامے والے بزرگوں سے اور دوسری طرف اپنے سیاسی مخالفوں سے بہت کچھ سُننا اور سہنا پڑا۔

کسی شخص کی انفرادیت اور عظمت کو سمجھنے کے لئے اُس کے ہم عصروں سے اُس کا مقابلہ و موازنہ بہت مفید ہوتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جیسے ماحول میں رہ کر ایک جیسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مختلف لوگوں نے کس طرح کا طرزِ عمل اختیار کیا تو ہمیں اُن کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کا مقابلہ و موازنہ اُن کے دو جلیل القدر ہم عصروں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال سے کیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یہی دو بزرگ ایسے ہو سکتے تھے۔ جن سے مولانا آزاد کا موازنہ کیا جاتا، اس لئے کہ موجودہ صدی کے نصف اوّل میں اسلامی ہند کو صحیح معنی میں یہی تین شخصیتیں ایسی میسّر آئیں جو دل و دماغ کی صلاحیتوں سے پوری طرح متصف تھیں اور جنھوں نے بعد میں آنے والوں کے لئے اپنے طرزِ عمل اور کردار سے جاندار اور صالح روایتیں قائم کیں۔

مولانا محمد علی ایک عملی انسان تھے اور اُن کا "عشق" انھیں آتشِ نمرود میں کود جانے کے لئے آمادہ رکھتا تھا لیکن وہ مولانا آزاد کی طرح علم و فضل کے اعلیٰ مقام پر متمکن نہیں تھے اور اس لئے اُن میں ضبط و تحمل اور استقلال و استقامت کے وہ بلند پایہ اوصاف نہیں پائے جاتے تھے جو مولانا آزاد کی انفرادیت کے سب سے روشن مینارے ہیں۔ اسے قاضی عبدالغفار اس طرح لکھتے ہیں: "مولانا محمد علی ایک عوامی لیڈر تھے اور ایک عوامی لیڈر کی طرح اپنے پاؤں کا زاویہ ہوا کے رُخ پر قائم کر سکتے تھے۔ مولانا (آزاد) اس مفہوم اور انداز کی عمومیت سے ہمیشہ بیگانہ رہے۔ کبھی ان دونوں کے طرزِ فکر میں کوئی نقطۂ اتصال پیدا ہی نہ ہو سکا۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ذہنی خلیج حائل ہے جس پر کوئی پُل نہیں باندھا جا سکتا۔ مولانا محمد علی بسا اوقات اپنے اعتقاد اور مخالف سے دست و گریباں ہو جانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت اُن کی عادت کا اظہار بھی جارحانہ ہو سکتا تھا لیکن مولانا (آزاد) بعض اوقات دوسروں پر اس لئے نکتہ چینی یا تعریض نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ کوئی احساسِ کم تری نہیں بلکہ ایک بہت صحیح اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدانِ جنگ میں اس لئے نہیں جاتی کہ اُسے کوئی برابر کا حریف نظر نہیں آتا۔"

ڈاکٹر اقبال عملی انسان بالکل نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی اور مفکّر تھے اور اس لئے اُن کا موازنہ مولانا آزاد سے فکر و نظر کی دُنیا ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو چیز سب سے زیادہ مشترک ہے وہ رمزِ خودی اور عرفانِ حیات کا فلسفہ ہے لیکن اس باب میں بھی مولانا آزاد کو ڈاکٹر اقبال پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی تشریح قاضی عبدالغفار اس طرح کرتے ہیں۔ "اقبال رمزِ خودی کا فلسفہ صرف مسلمان کے لئے پیش کرتے ہیں، اُسی کو اپنا مخاطب بناتے ہیں اور اُسی کو زندگی کا پیام دیتے ہیں مگر مولانا کا فلسفۂ حیات اقبال کے تصورات سے زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ وہ اقبال سے

"نہاد مذہبی" ہونے کے باوجود خود شناسی کے علاوہ تقاضوں کو انسانیت عالی کر ہر جاندار کے ساتھ منسوب کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ اقبال صرف مسلمانوں کے لئے قوتِ عمل کا ایک نسخہ تجویز کرتے ہیں اور مولانا تمام مخلوقات کی اس قوت نمو کا ذکر کرتے ہیں جو اس میں ودیعت ہے ۔ اقبال اپنے بلند ترین افکار میں انسانیت کے تصور سے اس قدر وابستہ نظر نہیں آتے جتنے کہ صرف اسلام اور مذہب کے تصور سے ..... اور اسی لئے اقبال کا پیام فرقہ پرستوں کے لئے فرقہ پرستی کا ایک نسخۂ اکسیر کھلا ماس گیا ورنہ خود شناسی اور خودی کا وہ عالمی عمل جس کو مولانا نے ایک چڑیا کے بچے کے پروں میں کارفرما دیکھا، انسانیت کے پیکر میں، اور بھی زیادہ نسل اور فرقہ اور مذہب کی تنگ نظری سے آزاد ہے۔"

مولانا آزاد کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے قاضی عبدالغفار نے اُن کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا ہے اور اپنی اس کوشش میں انھوں نے زیادہ مدد مولانا کی تحریروں خصوصاً "غبار خاطر" سے لی ہے۔ لیکن انھیں مولانا سے یہ شکوہ ہے کہ انھوں نے "اپنی اس نثر میں شعر کی تمام لطافتیں اس طرح سمو دی ہیں اور شاعرانہ استعارات و کنایات سے اس قدر کام لیا ہے کہ تنقید اور تبصرے کی راہ دشوار گزار ہو گئی ہے اور مغالطے سنگ راہ ہو سکتے ہیں۔ اُن کی شعریت نے ایک چادر بن کر اُن کے حقیقی تاثرات کو اِس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ بعض مقامات پر یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس نقطے پر شاعری ختم ہوئی اور حقیقت شروع ہوئی۔" کچھ اسی قسم کا شکوہ ہمیں قاضی عبدالغفار سے بھی ہے۔ جو کسر مولانا کی شعریت سے باقی رہ گئی تھی اُسے قاضی صاحب کی شعریت نے پورا کر دیا اور "تنقید اور تبصرے کی راہ" اور بھی دشوار گزار ہو گئی۔ بہرحال کہا جا سکتا ہے کہ "آثارِ ابوالکلام آزاد" مجموعی طور پر ایک عظیم اور مشکل شخصیت کو سمجھنے اور اُس کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کی کامیاب کوشش ہے، اگرچہ یہ اور زیادہ کامیاب ہو سکتی تھی اگر عقیدت کے ساتھ تنقید سے بھی کام لیا جاتا اور "مشکل شخصیت" کا تاثر پہلے ہی سے ذہن میں قائم نہ کر لیا جاتا۔

حیاتِ امید و موتِ قنوط

مایوسی سے بڑھ کر کوئی شئے انسان کی موت کے لئے قاتل و مہلک نہیں اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے جس نے زمینوں پر قبضہ کیا ہے، پہاڑوں کے اندر سے راستہ پیدا کیا ہے، سمندر کی قہاری کو مغلوب کیا ہے اور جب چاہا ہے اس میں اپنی سواری کے لئے راستہ نکالا ہے، اس کے کناروں کو میلوں اور فرسنگوں تک خشک کر دیا ہے۔ پھر امید ہی ہے جس نے مردہ قلوب کو زندہ کیا ہے، بستر مرگ سے بیماروں کو اٹھایا ہے اور قبر کے کناروں تک پہنچا دیا ہے، بچوں کو جوانوں کی تیزی سے موڑا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی و طاقت ور بنا دیا ہے۔

جبکہ دنیا جواب دے دیتی ہے، جبکہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے، جبکہ زمین کے کسی گوشے سے صدائے ہمت نہیں آتی اور جبکہ تمام اعضائے عمل جواب دے دیتے ہیں تو امید ہی کا فرشتہ ہوتا ہے جو مسکراتا ہے، اپنے پروں کو کھولتا ہے اور اس کے سائے میں بے کرامت و طاقت، ہمت و مستعدی جیسی دولت کی ایک روحِ تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لئے پہلی چیز امید ہے۔ جب تک انسان کے اندر امید قائم ہے مصیبتوں اور ہلاکتوں کے اگر پہاڑ بھی سامنے آ کھڑے ہوں تو بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔

اگر خون اور اس کا دوران انسان کی جسمانی حیات کے لئے ضروری ہے تو یقین کیجئے کہ اخلاقی و روحانی حیات کے لئے امید اس کے اندر مثل روح کے ہے جب تک اس کا دوران دل سے اٹھ کر دماغ تک اور پھر دماغ سے نکل کر جسم کے تمام گوشوں میں حرارتِ عمل پیدا کر رہا ہے، اس کی موت ممکن نہیں، وہ اس کے اعضائے کار متحرک اور قوائے مستعدی سرگرم کار ہیں۔ لیکن جہاں یہ روحِ حیات دل سے نکل پھر جسم انسانی کے لئے قبر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔"

("الہلال" ۹۔ اپریل ۱۹۱۳ء)

حمیدہ سلطان

زلیخا

دلکش آنکھیں، دراز پلکیں، جڑی بھنویں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بھرا ہوا
چہرہ، یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، لانبا سا قد مائل بہ گداز
دلآویز جسم، سفید کالی کسی کی سوتی یا ریشمی ساری بے پروائی سے پہنے سر پر
حیا آمیز اداؤں کا ہالہ لئے ہوئے جو میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے - یہ
پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زلیخا نہیں یوسف ہندی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد
کی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم تھیں۔

میری عمر سات یا آٹھ سال کی تھی دلی میں ایک زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی
اس کی صدارت بیگم صاحبہ بھوپال سلطان جہاں بیگم نے کی - ان کے ہمراہ مولانا آزاد
کی دونوں بہنیں آبرو بیگم صاحبہ اور فاطمہ بیگم صاحبہ بھی تشریف لائیں - ان دونوں کے
علم و فضل اور اردو زبان مضمونوں کی دھاک پڑھی لکھی خواتین پر بیٹھی ہوئی تھی - چونکہ
والدہ صاحبہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی ایک رکن تھیں اسی لئے ان کی
میزبانی کا شرف ہمارے گھر کو ملا - اس طرح دوستی کی بنیاد پڑی - پھر یہ مراسم
دن بدن بڑھتے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں ابا جان کی وفات کے بعد تین سال ہمارا
کلکتہ رہنا ہوا تو تعلقات بالکل عزیزانہ ہوگئے۔ یہ دونوں اپنے مکرم بھائی سے
ملنے جب کلکتے آئیں تو ہمارے یہاں بھی آئیں - میری بہن جمیلہ بیگم زلیخا آپا
سے والدہ صاحبہ کو ملایا - مولانا آزاد اس زمانے میں بالی گنج کی ایک شاندار
دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے والدہ مرحومہ پرانے زمانے کی بہت رکھ رکھاؤ
والی بیوی تھیں مگر ادھر تو بیگم آزاد کی پاکیزہ صورت، دل نشین اداؤں نے
ان کو کھینچا، ادھر وہ بھی شرمیلی اور کم آمیز ہونے کے باوجود کچھ ایسی گھل مل
گئیں کہ بلاناغہ ایک ہفتہ یہ وہاں جاتیں دوسرے ہفتے وہ یہاں آتیں۔ ان میں
وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی ضروری ہیں۔

وہ سلیقہ شعار بھی تھیں اور خانہ داری کے امور سے بھی بخوبی واقف
مہمان نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ شیریں زبان بھی۔ سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی
تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں۔ چونکہ آپس میں کافی بے تکلفی تھی اس لئے سیدھا
کے رستے کوسے کر دونوں میں مذاق بھی ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ صبح دس بجے کے بعد ہم ان کے یہاں پہنچیں تو خلافِ عادت آ
دن وہ پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور معانقہ کرتے ہوئے کہا۔ "معاف
کیجئے گا بھئی! آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا - میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی۔
بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ دو چمچے ابلے ہوئے چاول، تھوڑی
دال، سبزی یا گوشت اور دہی۔ چونکہ صبح بہت سویرے اٹھ جاتے ہیں اس
دوپہر کے کھانے کے بعد بارہ بجے سے بھی پہلے لیٹ جاتے ہیں پھر دو بجے غسل
کرکے نماز پڑھتے ہیں، اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور
ملنے والوں کا تانتا رات گئے تک لگا رہتا ہے۔"

بیگم آزاد کے بکھرے بالوں کی طرف اشارہ کرکے یہ بولیں "مگر بھاوج
ہوتا ہے ہمارے بھائی کو آپ کی یہ رعب پریشان سخت ناپسند ہے جو آپ
نہیں گوندھتیں"

وہ جس انداز سے لجا کر بولیں "اے نہیں نہیں یہ بات نہیں - ان
بار بار جیل جانے سے میری طبیعت کچھ ایسی ہیجانی ہو گئی ہے کہ چوٹی گوندھنے
سے دل گھبراتا ہے" وہ ادائے حجاب آج بھی مجھے یاد ہے - کیسی باحیا بیوی
تھیں اور کیا زمانہ تھا کہ شوہر کا ذکر کرتے بھی شرماتی تھیں - پھر اس دن ان

تعجب کرنے کی نشان گرگئی تھیں۔ پھر ان کی خالی کلائیوں کی طرف اشارہ کرکے کہا "اے روح! ایسی بھی کیا سادگی وہم نہیں آتا۔ اللہ تمہارا سہاگ قائم رکھے ایک ایک چوڑی ہاتھوں میں ڈال لیا کرو"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "آخر ہیں نا آپ بھی سدا بالکل سسرال والوں کی طرح طعنے دے رہی ہیں۔ اچھا آیندہ میں آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی"

دوسرے ہفتے جو وہ ملنے آئیں تو پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی۔ چکن کا جو بیل لگا ملاوز پہنے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساری زیب تن تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی دو دو چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں بندے۔ اچھے لباس اور ہلکی سی آرائش نے ان کی موہنی صورت کو اور بھی دلربا کر دیا تھا۔ پر ان کو گلے لگا کر مسرور لہجے میں بولیں۔ "اے ہے کہیں بری نظر نہ لگ جائے۔ آج تو ماشاء اللہ چشم بد دور بہت اچھی لگ رہی ہو" وہ حسب عادت لجا کر بولیں "آپ کو خوش کرنا تھا۔ ورنہ مجھے تو اب رنگین کپڑے اور زیور پہنتے شرم آتی ہے" "اے ہے تو اور سنو حد کر دی تم نے بھی۔ ابھی تمہاری عمر کون سی ایسی ہے جو گھس تو بڑھاپے میں بھی رنگا پیلا پہنتی ہیں"، انھوں نے کہا۔

مجھے ہر بار کتابوں کا لالچ جانے پر مجبور کرتا۔ مولانا صاحب کی لائبریری اوپر دالانے میں ہی تھی۔ میں جاتے ہی لائبریری میں گھس جاتی اور کتابیں وہاں سے لاتی پھر ان کو پڑھ کر رکھ دیتی اور لے آتی۔ میرے ذوق کی تسکین کا سامان فراوانی سے ملتا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اسی لائبریری میں ہی پہلی مرتبہ میں نے مولانا کی زیارت کی۔

اوائل گرمی کی ایک شام تھی۔ وہ دونوں بیبیاں باتوں میں لگیں۔ میں حسب معمول لائبریری میں پہنچ گئی۔ ایک سرخ و سفید رنگ کا تیکھے خط و خال والا انسان سفید کرتے پاجامے میں ننگے سر کتابوں کے اردگرد ڈھیر لگائے مطالعہ میں ایسا مصروف تھا کہ میں قریب پہنچ گئی اس کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے پڑھتا رہا۔ میں الٹے قدموں واپس ہوئی تو وہ محبت بھرے لہجے میں بولیں۔ "کیوں کتابیں نہیں ہیں؟" میں نے کہا "غالباً آج لائبریری میں مولانا صاحب تشریف رکھتے ہیں اسی لئے واپس آگئی۔"

"ارے ہاں وہی ہوں گے آج کل ان کو ذرا فرصت ہے اکثر شام کو ملنے والوں سے بچ کر لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ لیکن تم ڈرتی کیوں ہو۔ آؤ میرے ساتھ چلو میں ان سے تم کو ملوا دوں" انھوں نے ایک خاص انداز سے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ میں ڈرتی جھجکتی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انھوں نے میرا تعارف کرایا۔ مولانا صاحب نے مسکراتے ہوئے مہربانی کے لہجے میں فرمایا "آؤ بھئی جو کتاب چاہو لے لو۔" اور میں بت بنی کچھ دیر اس عظیم انسان کو دیکھتی رہی جو دنیائے علم و ادب، خطابت، مذہب، سیاست کا خورشید تاباں تھا۔ مولانا علیہ الرحمہ کی عظمت کا نقش میرے دل کے سادہ ورق پر اسی دن بیٹھا پھر عمر کے ساتھ میری عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا "کیا رتجگا کیا ہے تمہاری آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں"

وہ ہنس کر بولیں "آپ کی تو عادت ہے ہی بنانے کی۔ آج کل مولانا قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے باہر بھی حبس ہی رہتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔"

یہی تھا اس نیک بی بی کا وہ جذبۂ رفاقت جس کو یاد کرکے مرنے والی کے غم میں دل ہمارا احمد نگر قلعہ میں ایک پرانی قبر کو دیکھ کر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

بڑے آدمیوں کے سوانح حیات سب لکھے جاتے ہیں تو اکثر ان کی خانگی زندگی کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کے متعلق یہ جانیں کہ ان لوگوں کے گھریلو حالات کیا تھے اور اپنی بیوی سے ان کا برتاؤ کیسا تھا۔

مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ بارہ سال کے معصوم لڑکے تھے اور زلیخا بیگم چھ سال کی ننھی منی بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین صاحب بغداد کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے جا کر ملتا تھا۔ آفتاب الدین صاحب مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم ان کی پانچویں صاحبزادی تھیں۔ ان کے پیدا ہوتے ہی انھوں نے پیر کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ انھوں نے بہت محبت سے اس ننھی پیاری بچی کو گود میں لیا اور زلیخا نام رکھا۔ بعد میں یہ بھولی صورت والی بچی ان کو اتنی اچھی لگی کہ اس کو انھوں نے اپنی بہو بنا لیا۔ چھ سال کی بالی عمر میں زلیخا بیگم بیاہ کر آئیں۔ ان کے آنے سے دل پر اسی وقت سے

ہی اپنے یوسف جمال شوہر کا بعتہ ہوگیا اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اس عظیم انسان کی پرستش کرنے لگیں۔ مولانا کے ہر خیال کو اعوں نے سر آنکھوں پر رکھا۔ ہجر کی سختیاں بھی سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر لب پر کبھی اُف تک نہ لائیں۔ مولانا صاحب کی مالی حالت سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی وجہ سے کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ اگر ان کو اتنی مہلت ملتی کہ وہ صرف ادبی کام کرتے تو یقیناً دولت کی دیوی ان کے قدموں کو چومتی مگر ان کا حساس دل نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ انھیں لیس ماندہ قوم اور غلام ملک کا غم چین نہ لینے دیتا تھا۔ ان کی شعلہ نفسی اور آتش سانی قلم و زبان سے دلوں کو گرمانی رہتی۔ اور ان کی زینت حیات نہ اچھا کھاتی نہ اچھا پہنتی۔ ان تمام تکالیف کو محبت اور سکون سے برداشت کرتی جو شوہر کی جسمانی اور مالی پریشانی کی وجہ سے اس پر گذرتیں۔ زلیخا بیگم کا زیادہ وقت یاد الہٰی اور مولانا کی کامیابی کی دعاؤں میں گذرتا۔ ہر وقت کڑھتے رہنے کے باعث ان کی صحت گرگئی تھی مگر یہی سوچتی اپنی دُھن میں مگن رہی۔ اس خرابیٔ صحت کا ذکر کبھی مولانا سے نہیں کیا جس وقت بھی اور جتنے دن بعد بھی وہ گھر آتے یہ پاک طینت بیوی مسکراتی ہوئی ہمہ تن شوق بن ان کا استقبال کرتی اور ہر طرح شوہر کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تاکہ یہ تھکا ہوا دماغ جس کو سیاسی گتھیاں بھی سلجھانی تھیں اور مذہبی و ادبی کام بھی کرنے تھے گھریلو آرام دہ فضا میں آرام پاکر اور زیادہ ہمت و جوش سے کام کر سکے اور مولانا صاحب اسی پیکر صبر و ایثار کی بدولت ہر مرتبہ نیا ولولہ اور جوش لے کر جنگ آزادی کے لئے تیار ہو جاتے۔

وہ فطری طور پر آزاد طبیعت اور والہانہ جذبات کے مالک تھے۔ اسی لئے اپنی کم عمری کی شادی سے ایک دوسرے بڑے شاعر غالب کی طرح خوش نہیں تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو اپنی باوفا محبت کرنے والی بیوی کا خیال نہیں تھا یا ان کی ازدواجی زندگی رسمی نہیں گذری۔ زلیخا بیگم کی وفات کے بعد انھوں نے جو خط صدر یار جنگ کو لکھا ہے اس سے ان کے بے اندازہ غم کا اظہار ہوتا ہے۔

جب ۱۹۴۲ء میں مولانا کو اور تمام لیڈروں کے ساتھ احمد نگر قلعہ میں نظر بند کیا گیا زلیخا بیگم کی طبیعت کافی خراب تھی ان دنوں برٹش گورنمنٹ کا رویہ سخت ہو رہا تھا اور صورت حالات بہت تشویش ناک ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے تمام ہندوستان میں سیاسی نظر بندوں کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہو رہی تھیں اور یہ متضاد بھانت بھانت کی بولیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگم آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے چہیتے شوہر کے متعلق ہر نئی خبر سن کر وہ تڑپ کر رہ جاتیں۔ اُن کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ دوا انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غذا بھی برائے نام تھی۔ دق کا نامراد مرض دو سال سے چھپا بیٹھا ہوا تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا۔ ڈاکٹر بی سی رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کو دیکھا۔ مگر مرض کا افاقہ ہوتا جب کہ دوا تھی نہ غذا۔ وہ ہر ایک معالج سے یہی کہتی تھیں۔ "بس خدا کے لئے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو۔" ان کی حالت دیکھ کر اور التجا سن کر آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور کلیجہ پھٹ جاتا۔ کمرہ میں اور ڈاکٹروں کے جاتے ہی چارپائی سے اُٹھتا تھا۔ آخر بقول مولانا صاحب کے ۱۹- اپریل ۱۹۴۴ء کو زہر غم کارگر ہو گیا۔ زلیخا بیگم اپنے محبوب شوہر کے دیدار کی حسرت لئے اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ جسد بے جان تو سپرد خاک کر دیا گیا اور روح شاید قید جسم سے آزاد ہو کر بھی اپنے یوسف کے گرد پھر رہی ہوگی۔

مولانا صاحب غبار خاطر میں نواب صدر یار جنگ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

"گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر درپیش ہوئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ میں نے اس درجہ افسردہ اس کو کبھی نہیں دیکھا کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس پر غالب آگئی تھی۔ میں نے اس وقت تو ایسا ہی خیال کیا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

غم گسار و شفیق بیوی کے بعد مولانا صاحب کی زندگی کے معمولات میں تو بظاہر فرق نہیں آیا لیکن اُن کا دل بجھ گیا۔ وجود معنوی سراپا درد بن کر رہ گیا۔ اس جانگزا غم کے زیر اثر انھوں نے غبار خاطر کے ایک خط میں اپنے کو تنا برشتہ سے تشبیہ دی ہے جس کو موسم بہار کی جانفزا ہوائیں بھی تازگی نہیں بخش سکتیں۔ اپنے غمزدہ دل کو تھام کر بے اختیار فرماتے ہیں:-

شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

ان کا دل ... اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ رہا ہونے کے بعد جب وہ اپنی دلیتما کی آخری آرام گاہ پر گئے تو باوجود اس بے انتہا ضبط و تحمل کے جو اُن کی طبیعت کی خاص خصوصیت تھی اپنی چاہنے والی کے مرقد پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وفورِ رقت کو تھامنا ان کے بس میں نہ رہا اور بہت دیر تک وہ سر جھکائے روتے رہے۔ مولانا صاحب کی صحت بیوی کی وفات کے بعد دن بدن خراب ہوتی گئی اور مزاج کی شگفتگی بھی بہت کم ہو گئی۔ وہ بذلہ سنجیاں جو اُن کے مخصوص احباب کی محفلوں کو کشتِ زعفران بنا دیتی تھیں برائے نام رہ گئیں۔ وہ ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے زلیخا بیگم کی زندگی میں اُن کو غالباً یہ احساس نہ تھا کہ اس باوفا بیوی سے خود اُن کو بھی دل لگاؤ ہے لیکن مرنے والی کے چلے جانے کے بعد جیسے ان کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا اپنی زندگی کی یہ متاعِ عزیز بھی ملک و قوم پر وہ نچھاور کر چکے تھے۔ اسی خدا کی بھری ہوئی دنیا میں ان کے لئے کاموں اور مرحومہ کی یاد کے علاوہ کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے جیسے اور بہت سی خوبیوں سے مولانا آزاد کو نوازا تھا وہاں ایسی باوفا نیک طینت پاکیزہ صورت بیوی بھی عطا فرمائی تھی۔ زلیخا بیگم کی ذات پر عالمِ نسواں جتنا فخر کرے کم ہے۔ جس نے حسن و جمال کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ میرا یہ کہنا تعلّی نہیں حقیقت ہے۔ میری مرحومہ ماں حسن کی مورت تھیں اور بھی حسین و جمیل خواتین کو دیکھا لیکن جیسی معصومیت اور تقدس بیگم آزاد کی صورت پر میں نے دیکھا ایسا پھر کبھی کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اس دنیائے آب و گل کی بسنے والی ہستی نہیں آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی پاکیزگیٔ خیال کا یہ عالم تھا کہ کبھی ٹیلیفون کا ریسیور اس لئے نہیں اُٹھاتی تھیں کہ نہ جانے دوسری طرف کون اور کیسا آدمی بات کر رہا ہوگا۔ اس زمانے میں ایسی عفت مآب خواتین کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۴۷ء کے بعد میں اکثر مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی تھی جب بھی میں حاضر ہوتی وہ مجھ پر شفقت فرماتے۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو میں مرحومہ کا ذکر میں نے کیا۔ مولانا صاحب ایکدم اس طرح خاموش ہو گئے گویا اس ذکر نے ان کے دل پر نشتر لگا دیا۔ وہ بہت دیر سرنگوں خاموش بیٹھے رہے۔ میں بھی دم بخود بیٹھی ان کے اس جانکاہ غم کا اندازہ کر رہی تھی آخر یہ مفارقت کا طویل زمانہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کی آدھی رات کو ختم ہو گیا اور مولانا صاحب کی مقدس روح اپنی مسیحا کی تلاش میں عالمِ جاوداں کو سدھار گئی

غلام احمد فرقت کاکوروی
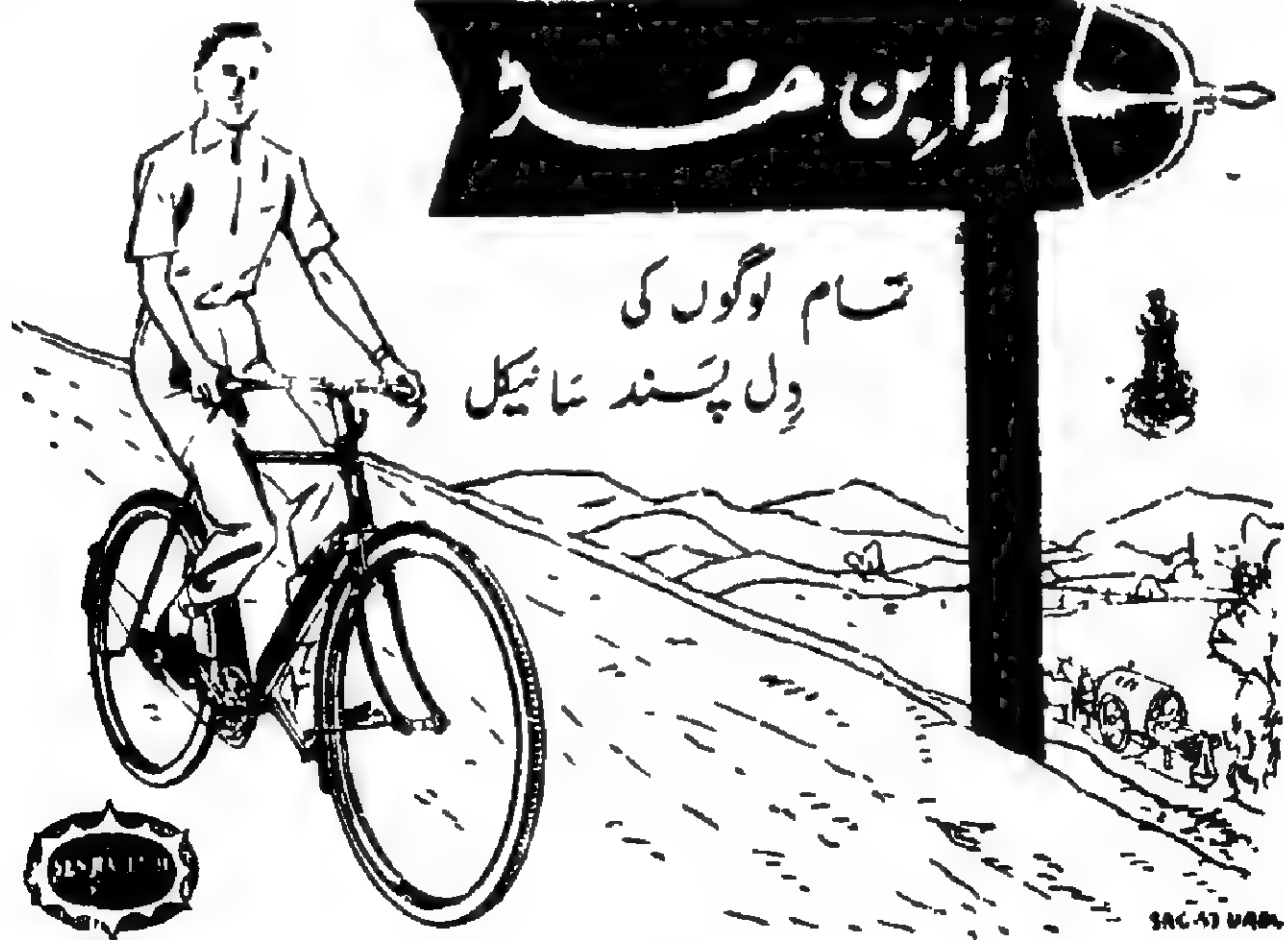
نگارشاتِ آزاد میں طنز و مزاح

ابتدائے آفرینش سے اب تک شاید ہی کوئی ایسی گھڑی ہو جس کی زندگی میں وہ لطف اور پُرمسرت لمحات نہ آئے ہوں جن میں انسان کا ہنسنے کو دل چاہتا ہے اور وہ دوسروں سے چہلیں کرکے اپنے لئے لطف و مسرت کا سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اس میں لطف اور مزاح، مہذب اور غیر مہذب، سعید اور غیر سعید کی تخصیص نہیں ہوتی

این سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہت سے لوگ جو بظاہر بہت سنجیدہ، مذہبی، خاموش اور اپنے آپ کو بہت ہی لئے دئے نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی بعض بعض اپنی زندگی میں بے حد شوخ اور بذلہ سنج ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خلوت و جلوت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بھی انھیں بزرگوں میں سے تھا جو بظاہر خاموش اور بباطن ایک باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ جیسا کہ جن لوگوں سے مولانا کی بے تکلفی تھی اُن کا کہنا ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں بے حد ملنسار، ہنس مکھ اور بذلہ سنج ہی نہیں تھے، بلکہ چلتے جملے اور رعایت لفظی یا اسی قسم کے کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کی فقرے بازی کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل رائے سے ہوتا ہے جو انھوں نے ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا شوکت علی مرحوم کے بارے میں قائم کی تھی

> "ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں پھیلانا ہو تو مولانا ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بہ سرعت یہ قلعہ بنا لیں گے۔ لیکن جب یہ قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو کیونکہ وہ پھر اُسی قلعہ کو ڈھا دیں گے۔"

اُردو زبان اگرچہ دنیا کی دوسری مشہور زبانوں کے مقابلے میں ایک نوعمر اور کم عمر زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں طنز و مزاح کا سرمایہ بھی دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں کم ہے مگر اس تھوڑے سے سرمایہ میں بھی وہ چمک دمک اور وہ تیکھا پن ہے کہ پڑھنے والا اس کی قدر میں شک کرنے لگتا ہے۔ اور ایک دوسری خصوصیت اس زبان کے بعض لکھنے والوں کی یہ ہے کہ متانت اور ظرافت دونوں میدانوں میں ایک جیسے رستم اور مرد میدان کا درجہ رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا جو اگر دنیا کی دوسری زبانوں کے ممتاز طنز نگاروں میں شمار کر دئے جائیں تو بہتوں کی نگاہیں ان پر جم کر رہ جائیں گی۔ اور ہم ان کے طنز کو پورے اعتماد کے ساتھ دنیا کی بڑی زبانوں کے انشاپردازوں کی نگارشات کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ اُن کی تحریر میں ایک ایسی انفرادیت پائی جاتی ہے جو اردو کے کسی طنز نگار یا انشاپرداز کے یہاں نہیں ملتی اور یہ واقعہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک منفرد زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اسی طرح ان کا طرزِ تحریر بھی تمام ادیبوں اور طنز نگاروں سے الگ تھلگ تھا۔ ان کے سوچنے کا انداز، اُن کی زبان اُن کے لہجے، ان کی عبارت اور الفاظ کی نشست و برخاست سب میں ایک انوکھا پن ہے۔ جب وہ نثر لکھتے لکھتے آخر میں کوئی شعر لکھ دیتے ہیں تو پوری عبارت میں ایک ترنم اور موسیقی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور پوری نثر اس طرح جگمگا اُٹھتی ہے کہ نثر پر نظم کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک برجستگی اور بے ساختہ پن ہے۔ 'غبار خاطر' میں ایک جگہ جب وہ ہندوستانی اور چینی چائے پینے والوں کو رد و قدح کرتے دیکھتے ہیں تو اپنے ایک خط میں نہایت شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ لکھتے ہیں۔

"دراصل یہ عالمگیر غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی، ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انہوں نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے اسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے۔

عشق ہائے معاملہ مت پوچھ
لوگ مانے کو رسا مانتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کمیاب ارزاں ہونے لگے، لپک کر اس پر ٹوٹ پڑی اور پھر تو گویا پوری نوع انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجماع کر لیا۔ اب آپ سر پیٹئے کون سنتا

اسی کی سی کہنے لگے اہل حشر
کہیں پرسش داد خواہاں نہیں"

مولانا کی بہترین مزاح نگاری اور بذلہ سنجی کی مثال ان کے ۱۷ اور ۱۸۔ مارچ ۱۹۴۳ء کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھے ہیں۔ ان میں چڑیوں کے تدارک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"چند دنوں تک تو میں نے صبر کیا لیکن پھر برداشت نے صاف جواب دے دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں

من و گرز و میدان و افراسیاب

یہاں میرے سامان میں ایک چھتری بھی آ گئی ہے۔ میں نے اٹھائی اور اعلان جنگ کر دیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کوتاہ دستی کے ساتھ ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں۔ حیران ہو کر کبھی چھتری کی نارسائی دیکھتا کبھی حریفوں کی بلند آشیانی۔ بے اختیار حافظ کا شعر یاد آ گیا

خیالِ قدِ بلند تو می کند دل من
تو دست کوتہ من بین و آستین دراز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی۔ برآمدہ میں جالا صاف کرنے کا بانس پڑا تھا۔ دوڑتا ہوا گیا اور اسے اٹھا لایا۔ اب کیدر پہنچئے کہ میدان کارزار میں کس درجہ کا رن پڑا۔ کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فردوسی اور نظامی کے رجزیہ اشعار بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے

ز خور دید ریگستاں گم
بہ سیرہ ہوا نیستاں گم

آخر میدان اپنے ہی ہاتھ رہا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کمرہ ان حریفان سقف و محراب سے بالکل صاف تھا

یکے تاختن تا بہ یکجا تاختم
ز گردن کشاں را سر انداختم"

یہ واقعہ ہے کہ جس طرح مولانا کا ایک مخصوص انداز بیان ہے اسی طرح ان کے موضوعات بھی مخصوص ہیں۔ ہر موضوع ان کے انداز تحریر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان کی خطابت، ان کی تحریر کا انداز اور اپنے مافی الضمیر ادا کرنے کا لب و لہجہ دوسرے لکھنے والوں سے بالکل ہی مختلف ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کے سوچنے کا انداز بھی سب سے جداگانہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے مزاح میں ایک خیر رعایت لفظی ہوتی ہے جس سے بعض مثال مزاح نگار بڑا ہی لطف پیدا کر دیتے ہیں اور پڑھنے والا نہ صرف ایک خاص قسم کی گدگدی محسوس کرتا ہے بلکہ مسکرا مسکرا کر زبان کے چٹخارے بھی لیتا رہتا ہے۔ مولانا جہاں رعایت لفظی سے مزاح پیدا کرتے ہیں وہاں بھی وہ اس فن کے ماہر نظر آتے ہیں۔ احمد نگر میں ایک مرتبہ باورچی کی دقت پیش آئی۔ قیدیوں میں کوئی باورچی نہ تھا۔ جیلر خاں (سپرنٹنڈنٹ جیل، یہ نام مولانا کا رکھا ہوا تھا) اس سلسلے میں بڑی مستعدی اور سرگرمی دکھاتا۔ چنانچہ ایک باورچی کا شہر کے کلکٹر نے انتظام کر دیا۔ دوسرے روز جب وہ اس قلعے میں لایا گیا تو اس کا حلیہ اور اس کی تصویر مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو:

"دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی اندر لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا طباخ (باورچی) موعود یہی ہے

آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

مگر نہیں معلوم اس غریب پر کیا بیتی تھی کہ آنے کو تو آ گیا تھا لیکن کچھ

ایسا گھبرایا ہوا اور سراسیمہ حال تھا جیسے مصیبتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ
پڑا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا اسے ہوش و حواس کا مسالہ کوٹنے لگا۔"

ایک مصیبت اس بدنصیب باورچی کے ساتھ یہ بھی تھی کہ اسے قلعہ سے باہر
جانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ حکومت کے لئے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس باورچی کو
دکھا کہاں جائے۔ اس مقام پر مولانا نے رعایت لفظی سے جو مزاح پیدا کیا ہے
اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"اسے کلکٹر کے یاران طریقت کی عقلمندی سمجھئے یا بے وقوفی کہ انہوں نے
پہلا مسئلہ کہ یہاں کے تمام قید خانے میں بھیج دیا۔ کیونکہ ان کے
خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ
قید خانے کی کوٹھڑی ہی تھی۔ قید خانے میں جو انہیں رات دن قید و بند کے
قصے سننے پڑے تو رہے سہے کی ساری ترکیبیں بھول گیا۔ اس احمق
کو کیا معلوم تھا کہ سالن اور شوربے کے عشق میں یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے
اس ابتدائے عشق ہی نے گویا دم نکال دیا تھا۔ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے قلیہ
بھی تیار ہو گیا

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا"

مولانا کے طنز میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اخلاص، سچائی
اور صداقت کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ ان کا طنز ہنگامی نہیں بلکہ دوامی اثرات کا حامل
ہوتا ہے۔ عموماً طنز کے حربے کو ہنگامی حالات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر مولانا کا
طنز اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا کے مخصوص
موضوعات سیاسی اور سماجی دونوں قسم کی اصلاح کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ
لکھتے ہیں پہلے اسے خود محسوس کرتے ہیں اور جب پورے طور پر اس جذبے کی
اپنے دل میں پرورش کر لیتے ہیں تب اس کی اپنے الفاظ اور اپنے قلم کی تلوار سے
کاٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ ان کی لسانی یلغاری الفاظ کا گھروندا نہیں ہوتی۔ وہ ایک
سیلاب، ایک طوفان بلاخیز کا دھارا اور ایک شمشیر آبدار ہے جس پر سنجیدگی اور
متانت کی صیقل بھی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کی مثال ایک
پہلوان سے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ابوالکلام کی شان اس پہلوان کی ہے جو وسط میدان جنگ
میں مبارز طلب ہو اور دوسروں کا نہیں بلکہ اپنے رجز سے خود
اپنا دل بڑھا رہا ہو۔"

جیل میں ڈاکٹر محمود کا ایک دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ وہ طشتری میں دانہ لئے
پرندوں کو آ آ کر کے بلاتے مگر ان آہوان ہوائی میں اتنی سمجھ کہاں جو وہ ڈاکٹر صاحب
کی طرف توجہ بھی کرتے۔ سید محمود اپنی اس ناکامی پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔
مولانا ان سے کچھ پوچھتے ہیں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر سید محمود کہنے لگے۔

"سید محمود کہنے لگے۔ عجب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا
پاس جاتا ہوں اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں گویا دانے کی
پیشکش بھی ایک جرم ہوئی

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

میں نے کہا طلب و نیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو غرور و ناز کے
تغافل کیشیوں کے لئے صبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیاز عشق کے دعوؤں
کے ساتھ ناز حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں۔"

جب ڈاکٹر سید محمود میناؤں کو دانہ دکھانے پر بھی اپنی طرف ملتفت نہیں
کر سکے تو مولانا لکھتے ہیں:-

"شہرستان ہوا کے دریوزہ گران بے برگ و نوا کوؤں نے ہر طرف سے
ہجوم شروع کر دیا ہے۔ میں نے کوؤں کو دریوزہ گران بے برگ و نوا اس لئے
کہا کہ کبھی انہیں بھکاریوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں، ہمیشہ دروازے پر
پہنچیں صدائیں لگائیں اور چل دئے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے"

جب ڈاکٹر سید محمود کو رفتہ رفتہ اپنے مقصد میں کامیابی ہونے لگی اور بجائے
میناؤں کے دوسرے پرندے اور خاص کر اُن کی طرف متوجہ ہونے لگے تو مولانا اپنے
مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:-

"صحن کے شمالی کنارے میں نیم کا ایک درخت ہے، اس پر چیلوں
کے جھنڈ کو دیکھتے ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

تو فوراً لبیک اور مرحبا عالی بر یادہ کہتے ہوئے اس دستر خوان یغما
پر ٹوٹ پڑیں

یاران صلائے عام است گر می کنید کارے

پھر ذرا گردنیں اٹھاتیں، ٹکڑا چباتی جاتیں اور سر ہلا ہلا کر یہ شعر

بھی کرتی جاتیں۔ گویا محمود صاحب کو داد ضیافت دیتے ہوئے طریقِ حسنِ طلب
بھی کہتی جاتی ہیں کہ

گرچہ خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں!

ڈاکٹر سید محمود کی سعادت سے متاثر ہو کر جب قلعہ احمد نگر کے اسیروں کی فرمائشیں
شروع ہو گئیں تو ان سے کہا گیا کہ حضرت اگر ممکن ہو تو فیضِ عام کا یہ سلسلہ کچھ دنوں
کے لئے ملتوی کر دیجئے۔ اس پر مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:۔

" ابھی سید محمود صاحب اس درخواست پر غور ہی کر رہے تھے کہ
ایک دوسرا واقعہ ظہور میں آگیا۔ ایک دن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ چھت
کی منڈیروں پر دو تین گدھ بھی تشریف لائے ہیں۔

پیری سے کمر میں اک ذرا خم توقیر کی صورتِ مجسم
اور گردن اٹھائے صلائے سفرہ کے منتظر ہیں
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی "

پھر جب وہ لنگر خانہ بند کر دیا گیا تو اس کے بند ہونے پر مولانا لکھتے ہیں:۔

" ان کی تشریف آوری ہمارے لئے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی
یہ گویا ادھر تو ان کا مبارک قدم آیا اُدھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے
اپنا سفرۂ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی
نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ ان کی آمد کی آبادی میں اس ہنگامۂ ضیافت
کی ویرانی پوشیدہ تھی۔ دیکھئے کیا موقع سے مومن خاں کا قصیدہ
یاد آگیا

طرح ہی آپ کے آتے ہی ہوا دیر خراب
مقصد کعبہ کا ہے کیجئے کا ، ایں پیس قدوم "

اسی طرح مولانا کے طنز و مزاح کے جو نمونے پیش کئے گئے وہ صرف ان کی کتاب
"غبارِ خاطر" سے تھے جن میں ان کے مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام
ہیں۔ ان خطوط کے علاوہ بھی ان کے اخبار "الہلال" میں حدیث الغاشیہ کے عنوان سے
ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا تھا جس میں اُن لوگوں پر طنز ہے جو ایک دن قبل
تک مسلم یونیورسٹی کے متعلق حکومت کی شرائط قبول کرنے کے بدترین مخالف تھے
مگر رات کو لیفٹیننٹ گورنر کے یہاں کھانا کھانے کے بعد انہوں نے اپنی رائیں بدل دیں
مگر اس طرح کا طنز صرف ان کے دو ہی تین مضامین میں ملتا ہے۔

" اتنے میں خبر آئی کہ (ہز آنر) کے ہاں (ڈنر) ہے۔ ہم نے کہا کہ
انا للہ وانا الیہ راجعون - قومی طاقت کے برادرانِ ابھی مرے ایک ...

اور "ان فعری جہری کا شوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسند تو پوچھا
چاہئے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے جواب ملا کہ
نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

یکچشم اگر نیست وابرد ان و ناز و عشوہ اے
الفراق اے ہوش و تقویٰ الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ طبیعت قدیم و جدید کو اکھا قائم کر کے
گھونٹ کے اندر اس دم سے سیر حالی ہو جاتا ہے علانیہ کو نہیں بلکہ صبح تک
اور انگریزی کھانا تو سادہ ہوتے ہوئے بھی سیر ہونے کے قدرتی طور پر دیر ہضم
ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی غذائے نفیس کیا تحقیق ہوگی کہ صبح تک معدے
میں فروکش رہے اور آواری طلبیں تو حلق کی جگہ تمدّد سے۔ مگر افسوس کہ
مدّت سے روز ہمارے طبی معلومات میں ایک انقلابِ عظیم واقع ہوا، طبی کانفرنس
کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں اب یقین
ہے کہ غذا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے اتنی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے
پھر اگر بقراط بھی نہیں ملیں تو ہم ان سے اس بارے میں "مکالمہ"
تیار ہیں کہ شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدہ
میں موجود رہتی ہے۔

دل از من، دیدہ از من، آستیں از من، کنار از من

لیکن یہ جو کچھ ہوا اس پر محض ایک سرسری نظر ڈال کر نہیں گزر جانا چاہئے
آج کل ہماری سطریں (عموماً مورہ) اور دریا دیلوں کے جنگلی طوفانوں
کی طرف لگی ہوئی ہیں اور جی نہیں چاہتا کہ اور کسی طرف دیکھیں۔ تاہم
ہم ناظرین سے کہیں گے وہ ان چند ہلکی لہروں سے بھی غافل نہ رہیں جو
۲۶۔ دسمبر کو (گومتی) کی ساکن و خاموش سطح میں اٹھی تھیں۔ عجب نہیں
کہ کسی وقت یہی گومتی کی لہریں قلزم کے طوفانوں کا کام دیں۔ فی الحقیقت
ان جلسوں میں صاحبانِ عقل و فکر کے لئے بہت سی عبرتیں تھیں جن کو
ایک ایک کر کے یاد کرنا چاہئے کیونکہ وہ مسلمانانِ ہند کے اس تغیر افکار و
اعمال کی پہلی منزلیں ہیں جن سے اس تغیر کا مستقبل وابستہ ہے اور
جس کی طرف ہم نے پچھلے (ان صبح امید" کے عنوان سے دو افتتاحیہ
مضمون لکھ کر توجہ دلائی تھی اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے تفصیل سے لکھیں"

یہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا طنز و مزاح اور انداز بیان جس پر اردو ادب
بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

فرمودات آزادؒ

"دنیا میں حق و صداقت کی آواز کبھی بھی تاج و تخت اور ایوان و محل کے اندر سے نہیں اٹھتی ہے بلکہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ ویران جنگلوں، بیابانوں کے صحرا نوردوں اور پہاڑوں کے اندر رہا ہے۔ اور یہ بھی اس شاہد عجائب پسند کا عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ہمیشہ شکستگی اور درماندگی ہی کو محبوب رکھتا ہے۔ اپنا گھر بھی بناتا ہے تو ٹوٹے ہوئے اور زخمی دلوں کو۔ اپنی آواز بھی سناتا ہے تو کانٹے پڑے ہوئے خشک حلقوں سے۔ اپنی نگاہوں کا جلوہ بھی دکھاتا ہے تو گردنوں کی خوں چکانی اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے اضطراب میں، اور پھر اپنے حسن و جمال کا جلوہ گاہ بھی بنائے گا تو تاریک غاروں میں شکستہ دیواروں اور پھٹی ہوئی چٹائیوں کو۔ پھر اگر وہ نہیں ہے تو کون ہے جس کا ناقہ گلیم فقر مسکینی سے نکلتا ہے اور بادشاہوں کے تخت و تاج کو الٹ دیتا ہے یا کس کی ماشاء اللہ ہے کہ جدے بے نوا فقیروں کو کھڑا کر دیتا ہے، اور وہ دنیا کی بڑی بڑی قوتوں کے تسلط سے نکال کر لاکھوں دلوں کو اپنے آگے سربسجود کرا لیتے ہیں۔

•

قومی حیات کا محل اس طرح تعمیر نہیں ہو سکتا کہ پہلے دیواریں کھڑی ہو جائیں پھر اس کی محرابیں اور اطراف و جوانب بھی تیار ہو جائیں گے کشاکش حیات و ممات اور تسابق اقوام کی کش مکش میں فرصت و مہلت کا سکون بغیر خواب ممات کے ممکن نہیں۔ یہاں تو ہر دم اور ہر لمحہ کام کئے جایئے اور ایک ہی وقت میں اس عمارت کے ہر حصے کی خبر لیجئے۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بن رہا ہے مگر پشت کی تیار کردہ دیواریں گر رہی ہیں۔ اس عالم میں جو کھو گیا وہ پھر نہیں ملتا اور جو وقت غفلت میں کٹا پھر اس کی تلافی کی مہلت نہیں دی جاتی۔

ہاں رہ عشق سست ہر کہ گستی ماند و باز گشت جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!

•

اس عالم اثر و تاثر میں ہر چیز کی طرح ہر عمل بھی ایک قدرتی طبیعت اور مزاج رکھتا ہے۔ تخریب کے مزاج میں شورش اور ہولناکی ہے اور تعمیر سرتا سر سکون اور خاموشی ہے۔ تعمیر جمع و نظم ترتیب اور ایجاب ہے۔ تخریب تفرقہ برہمی، اضطراب اور سلب و نفی ہے۔ جمع و نظم کی حالت ہی سکون ہے۔ اور تفرقہ و برہمی کی حالت ہی شورش و اضطراب کی حالت ہے۔ دیوار جب بنتی ہے تو کوئی ہولناکی محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے گرنے میں دھماکا ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر تخریب کا عمل تعمیر سے زیادہ نمایاں اور پر شور ہے۔ تخریب کی ہیبت فوراً ڈرا دیتی ہے لیکن تعمیر کی دلآویزی آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ تخریب کا دھماکا دور سے بھی سن لیا جا سکتا ہے لیکن تعمیر کا خاموش عمل دیکھنے کے لئے نزدیک آنے کی ضرورت ہے

•

دہقان ایک بیج اٹھاتا ہے اور زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب دیکھو کہ اس ایک بیج کے بارآور ہونے کے لئے قدرتِ الٰہی نے کس طرح اپنا کارخانۂ ہستی مہیا کر دیا ہے۔ سورج منتظر ہے کہ اپنی گرمی اس کے لئے وقف کر دے۔ بادل تیار ہیں کہ اپنے ذخیروں کا منہ کھول دیں۔ زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لئے وا کر دے۔ لیکن اس تمام کارخانۂ بخشش سے وہ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ خود اس کے اندر کی استعداد صحیح و صالح ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ تمام کارخانۂ بخشش و نوال اس کے لئے بے کار ہو گا۔ سورج اپنا دہکتا ہوا تنور رکھتے ہوئے بھی اسے گرم نہ کر سکے گا۔ بادل اگر اپنا تمام ذخیرۂ آب ختم کر ڈالے جب بھی اسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔

•

دونوں ہیں تو ہمسائے . . .
مگر ایک دوسرے سے پشتوں دور !

یہ دونوں آپس میں ہمسائے ہیں، دیکھئے ۔ ایک سا لباس، ایک سی خورد و باش، مگر یہ نہ سمجھئے کہ دونوں ہر پہلو سے ایک سے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی انفرادیت ہے۔ اور کبھی کبھی تو ہمسائیوں کے ذہن اور خیالات میں پشتوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔

انسانی طبیعت کی بو قلمونی کا مطالعہ بہت دلچسپ مسئلہ ہے۔ ہندوستان لیور میں ہم مارکیٹنگ ریسرچ کے جدید علم کے ذریعے ہندوستان کے ہر طبقے کے مرد و عورت کے رجحانوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی مانگیں، امنگیں، پسند، ناپسند۔ ہمیں ان سب سے دلچسپی ہے۔ اس سے ہمیں آپ کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ آپ کی مرضیات سے واقفیت ہوتی ہے جس کے مطابق ہم ٹھیک پسند کی مصنوعات تیار کر سکتے ہیں جو آپ کے حالات پر پورے اتریں اور آپ کی گھریلو زندگی میں آسائش بہم پہنچائیں۔

سینکڑوں ملاقاتیں۔ ہزاروں سوال جواب۔ اعداد و شمار۔ انہیں ملا کر کمال کی چھان بین کے بعد ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ۔ ان مرحلوں سے گزر کر ہمیں آپ کی ضرورتوں کی صحیح تصویر حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح 'مارکیٹنگ ریسرچ' کے ذریعے آپ اپنے مشوروں سے ہماری رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مصنوعات ہم آخر آپ ہی کے لئے تو تیار کرتے ہیں۔

ہندوستان لیور کا آدرش - گھر گھر کی خدمت

جب آپ ریل سے سفر کرتے ہیں !
تو کیا آپ زیورات، قیمتی پتھر، گھڑیاں، ریشمی کپڑے، شال دوشالے، کشیدے
ساز موسیقی یا دوسری قیمتی چیزیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں !
اگر ایسا ہے تو آپ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ جب آپ ایسی چیزیں ریلوے کے سپرد کریں اور ان چیزوں
کے کسی ایک پیکج کی قیمت تین سو روپے سے زائد ہو تو آپ کو یہ کرنا چاہیئے :-
۱۔ بکنگ کراتے وقت ان چیزوں کی قیمت لکھ کر دے دیں ۔ اور
۲۔ بھاڑے کے علاوہ ان چیزوں کی قیمت کا ایک فیصدی حصہ ادا کر دیں ۔
اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو ریلوے ان چیزوں کی گم شدگی، ٹوٹ پھوٹ، خرابی یا نقصان کی ذمہ دار نہ ہوگی ۔

ہماری کتابیں
نام کتاب
قیمت
ڈاک خرچ
دیس دیس کی لوک کہانیاں
۷۵ نئے پیسے
۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں
ایک روپیہ
۲۵ نئے پیسے
کیلنڈر کی اِصلاح
۲ نئے پیسے
۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی
۷۵ نئے پیسے
۲ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے
۲۵ نئے پیسے
۱۵ نئے پیسے
جواہرلال نہرو کی تقریریں (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶)
۱ نئے پیسے (فی کاپی)
۸ نئے پیسے (فی کاپی)
پچیس روپیہ یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائیگا
منی آرڈر اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

ہندوستان کے کلچر اور تعمیر و ترقی

کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ رسالے پڑھئے

انگریزی رسالے

انڈین انفارمیشن

(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک بھر میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں

قیمت فی کاپی ۳۰ نئے پیسے سالانہ چندہ چھ روپے

مارچ آف انڈیا

"ہندوستان اور اس کی ترقی کا دلچسپ مرقع"

(سنڈے نیوز آف انڈیا)

فی کاپی ایک روپیہ سالانہ چندہ دس روپے

کشمیر

کشمیری زندگی اور اس کے مسائل سے متعلق انگریزی ماہنامہ جو دلکش مضامین اور خوبصورت تصاویر سے مرتب ہوتا ہے

فی کاپی ۵۰ نئے پیسے سالانہ چندہ پانچ روپے

بھاگیرتھ

سینٹرل واٹر اینڈ پاور کمیشن کا سرکاری ترجمان - اس میں ہندوستان کے آبپاشی اور بجلی کے منصوبوں سے متعلق معلومات شائع کی جاتی ہیں

فی کاپی ۲۵ نئے پیسے - سالانہ چندہ تین روپے

سوشل ویلفیئر

سنٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ کا انگریزی ماہنامہ جس میں ملک کی سماجی بہبود سے متعلق مختلف مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے - سالانہ چندہ چار روپے

انگریزی اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والے رسالے

کُروکشیتر

اس مصور ماہنامہ کا مقصد کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی اشاعت ہے۔

فی کاپی ۵۰ نئے پیسے سالانہ چندہ چار روپے

گرام سیوک

یہ رسالہ کمیونٹی پراجکٹ ایڈمنسٹریشن کے تحت کام کرنے والے گرام سیوکوں کی رہنمائی کے لئے شائع ہوتا ہے۔

فی کاپی ۱۵ نئے پیسے۔

— سالانہ چندہ ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے

یوجنا (پندرہ روزہ)

چیف ایڈیٹر - جوت سنگھ

اس میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں اور ملک بھر میں جو مختلف قسم کے ترقیاتی کام ہو رہے ہیں اُن کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ فی کاپی ۱۰ نئے پیسے

سالانہ چندہ دو روپے پچاس نئے پیسے

ہندی رسالے

بھارتیہ سماچار

(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اعلانات اور ملک میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں

فی کاپی ۲۰ نئے پیسے سالانہ چندہ ۵ روپے

آج کل (ہندی)

یہ ایک ثقافتی رسالہ ہے جس میں ملک کے سماجی ثقافتی مسائل اور تہذیبی حالات سے متعلق مضامین کہانیاں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں

قیمت فی کاپی ۵۰ نئے پیسے

سالانہ چندہ چھ روپیہ

بال بھارتی

ہندی میں بچوں کا مصور رسالہ دلچسپ کہانیاں بچوں سے متعلق مضامین اور چٹکلے اس میں شامل ہوتے ہیں

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے

سالانہ چندہ چار روپے

سماج کلیان

ہندی میں سنٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ کا ترجمان

فی کاپی ۳۵ نئے پیسے

سالانہ چندہ چار روپے

ان رسالوں میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

یہ رسالے مشہور کتب فروشوں اور اخباری ایجنسیوں سے مل سکتے ہیں

یا براہ راست اس پتہ پر لکھئے

پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ، پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

Edited and Published by the Director Publications Division and printed by the Production Officer, United Press Government of India Old Secretariat Delhi

Regd No D—509